مدیر
سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
بانی
فخر المحدثین حضرت مولانا
سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ
مدیر
سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری
بیادگار
محدث عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ
جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا
علمی
دینی
ادبی
ترجمان
ماہنامہ
محدثِ عصر
جلد نمبر ۱۹_۱۸، شمارہ نمبر ۷، سلسلہ نمبر ۱۸۲
دسمبر ۲۰۱۷ء
جنوری
فروری ۲۰۱۸ء
مجلس ادارت
مولانا عبدالرشید بستوی
09634506041
مولانا فضیل احمد ناصری
08881347125
نگران ترسیل
مولانا ابوطلحہ اعظمی
09997504588
اشتراک وتعاون
اندرون ملک:
فی شمارہ -/15 سالانہ -/150
خصوصی -/1000
تاحیات -/10000
بیرونِ ملک:
سالانہ: 20 امریکی ڈالر
خصوصی: 100 امریکی ڈالر
تاحیات: 500 امریکی ڈالر
شائع کردہ
جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند
عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)
فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371
موبائل (مدیر): 08006075484
ای میل: ahmadanzarshah@gmail.com
مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت دیوبند کو ہی ہوگا۔
Designed By: Sadique Graphics Deoband # 9319903128 / 9520903128

ورق در ورق

عصریات

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

جس کا ڈر تھا، بالآخر وہی ہوا۔ طلاقِ ثلاثہ معاملے پر سپریم کورٹ کی ہدایت کے بعد حکومت نے قانون کا مسودہ تیار کر ہی لیا، جسے لوک سبھا میں ۲۸ دسمبر ۲۰۱۷ء کو پیش بھی کر دیا گیا۔ یہ قضیہ کچھ اس شد و مد سے اٹھایا گیا، گویا کہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ملک کے تمام ذرائع ابلاغ اسی پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے رہے۔ حالاں کہ وطن عزیز بے پناہ مسائل سے دو چار ہے۔ قتل و غارت، فسادات، مہنگائی اور عوامی بے چینیاں۔ مگر سب کو چھوڑ چھاڑ کر طلاق ثلاثہ کے موضوع پر اتنی دل چسپی دکھائی گئی کہ جیسے ہندوستان کی ترقی کی شاہ کلید یہی ہو۔ لوک سبھا میں بل پاس ہوا۔ کانگریس نے معمولی مخالفت درج کرائی، دیگر چھوٹی پارٹیوں نے بھی ہلکی پھلکی آواز بلند کی، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ سیاسی جماعتوں نے حکمراں جماعت کی مدد تو کی ہی، جو لوگ اپنے کہے جاتے ہیں یعنی مسلم ووٹوں سے اونچی پرواز پانے والے مسلم ممبران۔ خاموش رہ کر انہوں نے بھی مدد کی۔ سب کی زبان پر قفل چڑھا رہا۔ بل کی مخالفت میں زوردار آواز اگر کسی نے اٹھائی تو وہ ایم آئی ایم ہے۔ اس کا موقف مضبوط بھی تھا، مدلل بھی اور معتدل بھی۔ مگر جہاں پوری منصوبہ بندی ہو چکی ہو، وہاں محض ایک آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، قانون لوک سبھا میں منظور کر لیا گیا۔

کسی قانون کے آئینی درجہ پانے کے لئے صرف لوک سبھا کافی نہیں، اس کے لیے راجیہ سبھا میں بھی کامیابی ضروری ہے۔ یہ بل لوک سبھا میں بھگوا جماعت کے غلبے کی بنا پر منظور تو ہو گیا، مگر راجیہ سبھا میں اس کی راہوں میں شدید رکاوٹیں پڑ گئیں۔ یہاں کانگریس ممبران کی اکثریت ہے۔ کانگریس مصر رہی کہ اسے سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کیا جائے، کیوں کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں، تین سال کی سزا مناسب نہیں؛ لیکن حکومت راضی نہیں ہوئی۔ بل راجیہ سبھا سے پاس تو نہ ہو سکا، تاہم تجزیہ نگاروں کا اندیشہ ہے کہ آرڈی نینس لا کر اس قانون کو منظوری دے دی جائے گی، اگر واقعی یوں ہوتا ہے تو یہ جمہوریت کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔

افسوس تو اس کا ہے کہ طلاق مخالف بل کو مرکز نے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے، وہ ہر حال میں اسے پاس کرانا چاہتا ہے۔ عام لیڈران سے لے کر مرکزی شخصیات تک اس بل کو لے کر سخت فکر مند ہیں۔ پارلیمانی امور کے مرکزی وزیر اننت کمار نے بجٹ اجلاس میں بہر طور اسے پاس کرانے کا عزم کیا۔ وزیر اعظم نے اس بل کے لئے حزب

اختلاف سے گزارش کی کہ راستہ صاف کر دیا جائے۔ اب تو صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے بھی بجٹ اجلاس کے پہلے دن بہت واضح لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ طلاق بل جلد ہی قانون کی شکل اختیار کر لے گا۔

طلاق بل کیا ہے؟ ایک عجوبہ ہے، ایک تضاد ہے، ایک پہیلی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم پرسنل لاء کے بھی سخت خلاف ہے، یہ بل کہتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے کی صورت میں ایک بھی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ جب طلاق ہی نہ پڑی تو نہ رجعت کا مسئلہ ہے، نہ عدت کا۔ مزید برآں شوہر کو تین سال عقوبت خانے میں گزارنے پڑیں گے، عورت اور اس کے بال بچوں کا نان نفقہ بھی مرد ہی کے ذمے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ یہاں یہ سوال بھی قائم ہوتا ہے کہ جب مرد تین سال جیل میں رہے گا، تو بیوی بچوں کا نفقہ کس طرح برداشت کرے گا؟ نیز یہی ایک خرابی نہیں، بلکہ متعدد پیچیدگیاں اس میں گندھی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے کی تفصیلی بحث اسی شمارے کے صفحات میں مطالعہ فرمائیں۔

ایک مسلم مسئلے کو جس طرح قومی اور ملکی مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ بے حد افسوس ناک ہے۔ حکومت کی شدید دلچسپی سے مترشح ہوتا ہے کہ طلاق کی شرح سب سے زیادہ مسلمانوں میں ہی ہے اور یہ کہ مسلم خواتین سخت عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلم مرد ظالم و جابر اور خواتین کے سخت دشمن ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر ملک کے سارے ہی مسلمانوں نے اس بل کو نامنظور کر دیا ہے، اور واشگاف کر دیا ہے کہ ہمیں اسلامی قوانین سے متصادم کوئی قانون منظور نہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی مختلف طریقوں سے حکومت کو آئینہ دکھایا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم عوام کو بیدار کرنا ضروری ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی روح کو سمجھ سکیں اور اپنے مسائل کا حل شرعی عدالتوں سے حاصل کریں۔

***

ملک میں زعفرانی آندھیوں کے دبدبے کے بعد پے در پے فسادات اور مسلسل تشدد اس کا مقدر بن چکا۔ آئے دن ہنگامہ خیزیوں کی خبریں ہیں۔ سفر و حضر کچھ بھی محفوظ نہیں۔ لوگ اپنے گھروں سے نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شر پسند بہانے بہانے سے مسلمانوں کو اذیتیں پہونچا رہے ہیں۔ ملک کی ہم آہنگ فضا کو ایسی دیمک لگ گئی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات عام سی بات ہوگئی۔ کاس گنج کا بلوہ تو ابھی تازہ ترین ہی ہے۔ یہاں کس بے دردی سے مسلمانوں کو ہدف بنایا گیا۔ معمولی نوک جھونک کے بعد کس طرح ایک سادہ سا مسئلہ پیچیدہ ترین معمہ بنا دیا گیا۔

۲۶/ جنوری کو یوم جمہوریہ منایا جا رہا تھا۔ مسلمان اس کی تقریب کے لئے جلسہ گاہ تیار کر رہے تھے۔ ادھر ۵۰/ نوجوان موٹر سائیکلوں پر سوار اپنے ہاتھوں میں پرچم لئے گزرنے پر بضد۔ پرچم ترنگا بھی تھا اور بھگوا بھی۔

شاہ راہ کو چھوڑ کر گلی کی راہ پکڑنا ان کی نیت کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ یہ روایتی ترنگا یاترا معمولاً شاہ راہ سے نکلتا رہا ہے۔ تقریب کے سبب سے گلی کا یہ راستہ بند تھا، معمولی کہا سنی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے فساد کا ایک بھیانک منظر۔ اس فساد میں چندن گپتا نامی ایک نوجوان مارا گیا۔ اس کے بعد کاس گنج مسلمانوں کے لئے عرصۂ محشر بن گیا، متواتر کئی دن تک کرفیو نافذ رہا۔ دی وائر کی ایک رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی بڑی بڑی دکانوں کو چن چن کر جلایا گیا، ان دکانوں کو مزید ہدف بنایا گیا، جو ہندوؤں کی دو کانوں کے درمیان واقع ہیں۔ عبادت گاہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ مسجدوں کی توڑ پھوڑ آج بھی جاری ہے۔ انتظامیہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور تشدد کی کارروائیاں جاری رہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ پولیس مسلمانوں کو ہی گرفتار کر رہی ہے، ۸۰ / سے زیادہ لوگ دار و گیر کی زد میں آئے۔ گھروں میں گھس کر اور دروازے توڑ کر مظلومین کو ہی پکڑا جا رہا ہے۔ پورا گاؤں دہشت زدہ ہے۔ مسلمان خوف کے سائے میں جینے پر مجبور ہیں۔ ہمیشہ کی طرح ذرائع ابلاغ آگ میں گھی ڈالنے کا کام پیہم کرتے رہے۔ جب کہ حقیقت وہ نہیں، جو میڈیا دکھا رہا ہے۔ ۲ /فروری کو سماج وادی پارٹی کے رہ نما رام گوپال یادو نے پارلیمنٹ میں بجا کہا ہے کہ ہندو نے ہی ہندو کو مارا اور الزام مسلمان پر لگا دیا گیا۔

کس قدر حیرت ناک منظر ہے کہ رگڑے جھگڑے کے بہانے تلاش کئے جا رہے ہیں، افسوس تو اس کا ہے کہ تشدد کا نشانہ بھی مسلمان ہی ہو رہا ہے اور وہی جیل بھی جا رہا ہے، چندن گپتا کے قتل کا الزام سلیم پر ڈال دیا گیا۔ متعدد نوجوانوں کے ساتھ اب وہ بھی پولیس کی گرفت میں ہے۔ آگے کیا ہوگا اللہ ہی جانتا ہے۔

یہ فسادات ملک کی سالمیت کے لئے اچھے اشارے نہیں ہیں۔ ان سے ہندوستان کی شبیہ مزید بگڑے گی اور عالمی برادری میں اس کا وقار مزید مجروح ہوگا۔ حکومت کو جمہوری اقدار کی بحالی کی مہم تیز تر کرنی چاہئے۔ اس کے لئے تقریبات منعقد کرنے چاہئیں۔ فسادت کو ہلکے میں لینا اور خاطیوں کے خلاف مؤثر کارروائی نہ کرنا ملک کے لئے نقصان دہ ہی ثابت ہوگا۔

***

جب بڑوں کے اذہان خراب ہو جائیں تو ان کے اثراتِ بد چھوٹوں پر تو پڑتے ہی ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے راہ نما جب اشتعال انگیزی کر رہے ہوں تو چھوٹوں کی بات کیا؟ اشتعال انگیزی کرتے ہوئے اب لوگ آئین شکنی سے بھی گریز نہیں کرتے، اتر پردیش کے ڈی جی ہوم گارڈ نے ایک تقریب میں جے شری رام کا نعرہ لگاتے ہوئے رام مندر تعمیر کرنے کا حلف لے لیا، حالاں کہ بطور ڈی جی ان کا سیاسی تقریب میں حصہ لینا اور رام مندر تعمیر کی قسمیں کھانا ''سروس رول بک'' کی صریح خلاف ورزی ہے، آئین شکنی کی اس سے بڑی مثال نہیں ہو سکتی۔ صوبے کے سینئر پولیس افسر ڈی جی ہوم گارڈ سوریہ کمار شکلا نے لکھنؤ

یونیورسٹی میں کھلے پلیٹ فارم سے رام مندر کو جلد سے جلد بنانے کے عزم کا اظہار کیا۔ ان کی طرف سے لیا گیا یہ حلف سپریم کورٹ کے احکامات کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے، حالاں کہ وزیر اعلیٰ یوگی نے ڈی جی سے فون پر بات کی ہے، مگر ڈی جی صفائی دیتے پھر رہے ہیں، اب تو اس حلف کا ویڈیو عام ہو چکا ہے او ر دیکھنے والے اسے دیکھ ہی رہے ہیں۔

یہ نہایت بدترین ہے کہ آئی پی ایس افسر آئین شکنی کا ارتکاب کرے۔ آئین کا تحفظ یہ نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ کیا ملک اسی طرح کی اشتعال انگیزی سے چلے گا؟ یہ شرمناک حرکت ہے۔ بڑی حیرت ہے کہ اب ایسے لوگ بھی کلیدی عہدوں پر تعینات ہونے لگے، ان سے ملک اور قوم کی حفاظت کس طرح ممکن ہے؟۔

❋❋❋

ملک اس وقت بدامنی کے کس نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سپریم کورٹ کے چار بڑے ججوں نے چیف جسٹس دیپک مشرا کے خلاف باقاعدہ پریس کانفرنس کر ڈالی۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد معاملہ تھا۔ اس نے ملک میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ کئی دنوں تک اسی کے قصے رہے۔ اگر چہ فی الوقت یہ معاملہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔

سپریم کورٹ کے چاروں ججوں نے پریس کانفرنس کر کے چیف جسٹس کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ ان کا الزام تھا کہ عدالتی اصولوں کے خلاف چیف جسٹس اپنی پسند کے بینچوں کو کیس دے رہے ہیں۔ عدالت میں سب کچھ درست طریقے سے نہیں ہو رہا۔ ایسے کام ہو رہے ہیں، جو نہیں ہونے چاہییں۔ اگر عدالتی نظام پر لگام نہ لگائی گئی تو جمہوریت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

ان ججوں کے نام جوزف، چیلا میشور، مدن لوکر اور رنجن گوگوئی ہیں۔ ملک کے لئے ان کی بڑی خدمات ہیں۔ ججوں کی اس کانفرنس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ صلح مصالحت کے لیے حکومت نے بھی اپنی والی کوششیں کر ڈالیں۔ سپریم کورٹ بار کونسل نے بھی سات رکنی کمیٹی بنائی۔ خدا کرے کہ سب ٹھیک ٹھاک رہے۔

عدالتوں میں یہ مداخلت ان کی صحت کے لئے مثبت اشارے نہیں ہیں، عوام کا اعتماد اگر کسی پر رہ گیا ہے تو وہ ''عدلیہ'' ہی ہے۔ اگر یہاں بھی شفافیت نہ رہی اور انصاف کے تقاضے پورے نہیں کئے گئے تو عدالتوں میں کون جائے گا؟۔

❋❋❋

بی جے پی کی حکومت کے بعد ملک خوف و دہشت کی گویا علامت بن گیا۔ مذہبی تشدد میں لگاتار اضافے ہیں۔ عدالتوں کا احترام بھی دلوں سے رخصت ہو گیا۔ آئین کی بے حرمتی ایک معمولی بات ہو کر رہ گئی۔ راجستھان میں محمد افراز الاسلام کے قتل کے بعد اس کے قاتل شمبھولال کی حمایت میں اس کے گرگے اتنے

ازخود رفتہ ہوئے کہ دفعہ 144 نافذ ہونے کے باوجود اُدے پور کورٹ کے پیچھے کی عمارتوں سے چھت پر چڑھ گئے اور اس کے مرکزی دروازے پر بھگوا پرچم لہرا دیا۔ انہوں نے دھمکی بھی دی کہ اب مولویوں کو گھروں میں گھس کر ماریں گے۔ ملک کی سیکولر شبیہ عالمی سطح پر بھی بہت بری طرح بگڑ گئی ہے۔ گاؤکشی کے خلاف گئو رکشکوں نے جس طرح کی فضا بنائی تھی، اس نے وطن عزیز کی تصویر ہی بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ قومی تو قومی، عالمی سطح پر بھی اس کی تنقید ہو رہی ہے۔ تنزانیہ کے ممبرِ پارلیمنٹ سلیم ترکی نے ہندوستان کی وزیر خارجہ سشما سوراج سے بہت ہی واضح الفاظ میں کہا ہے کہ بھارت میں گئو رکشا کے نام پر ہو رہے تشدد سے بے حد فکرمند ہوں۔ یہ قضیہ ملک کے لیے ناسور بن چکا ہے۔ یہ ہرگز مناسب نہیں۔ امریکی نوبل انعام یافتہ جوناتھن گراس نے بھی کولکاتا میں خطاب کے دوران ہندوستان کے اس بدلتے مناظر پر کڑی تنقید کر ڈالی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''انڈیا'' میں مذہبی نفرت میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے، سیاست داں کرسیوں کے حصول کے لیے یہ بے ہودہ حرکتیں انجام دے رہے ہیں۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ جس ملک نے مہاتما گاندھی جیسے عظیم مردِ آہن کو جنم دیا، وہ ۲۱ ویں صدی میں بھی ذات پات کے نظام کا شکار ہے۔

مسلمان تو ڈرے ہوئے ہیں ہی، اکثریتی فرقے کے لوگ بھی بری طرح ہراساں ہیں۔ بھاجپا اور آر ایس ایس کے خلاف روز تبصرے آ رہے ہیں۔ مبصرین کوئی اور نہیں، اکثریتی فرقے کے لوگ ہیں۔ مایاوتی نے تنگ آ کر بدھ مت اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ کرناٹک کے وزیر اعلیٰ سدارمیا نے ۱۱ر جنوری کو کہا کہ بی جے پی اور آر ایس ایس کے لوگ ہندو تو دہشت گرد ہیں۔ اس بیان پر کافی ہنگامہ ہوا، مگر سدارمیا اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ آئین ہند کے تخلیق کار بھیم راؤ امبیڈکر کے پوتے پرکاش امبیڈکر نے تو عجیب و غریب بات کہہ ڈالی۔ بھوپال میں انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ بھیما کورے گاؤں سانحہ کے قصورواروں پر اگر حکومت نے کارروائی نہیں کی تو ہندوؤں میں بھی حافظ سعید پیدا ہوں گے۔ شری رام سینا کے بانی پرمود متھالک نے آر ایس ایس کی طرف سے جان کا خطرہ محسوس کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اپنے دشمنوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آر ایس ایس سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ گجرات کے ہاردک پٹیل بھی اسی المیے سے گذر رہے ہیں۔ اس سے قبل وشو ہندو پریشد کے چیئرمین پروین توگڑیا نے بھی زعفرانیوں کی طرف موت کا ڈر محسوس کیا تھا۔ وہ تو باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر روئے بھی تھے۔

یہ اور اس طرح کی باتیں ملک کی تقدیر بن چکی ہیں۔ عوام ہوں یا خواص، سن سن کر اکتا چکے ہیں۔ بدامنی اور اشتعال انگیزی انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ ظالم طبقہ بے تکلف مظالم ڈھا رہا ہے۔ قانون کا ڈر اور عدالت کا خوف اسے ذرہ برابر نہیں۔ کیا ملک فسادات اور نفرت و تشدد سے ہی آگے بڑھے گا؟

قسط (۶)

ذٰلك الكتاب

فخر المحدثین حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ

او علی جملة معانیه من الحکم النظرية و الاحکام العملية التی هی سلوک الطريق المستقیم الاطلا ع علی مراتب السعداء و منازل الاشقياء و سورة الکنز و الوافية و الکافية لذالک و سورة الحمد و الشکر و الدعاء و تعلیم المسئلة لاشتمالها علیها و الصلوٰة لوجوب قراءتها و استحبابها فیها الشافیه و الشفاء لقوله صلی اللہ علیه و سلم هی شفاء لکل داء و السبع المثانی لانها سبع أیات بالاتفاق الا ان منهم من عد التسمية أية دون انعمت علیهم و منهم من عکس و تثنی فی الصلوٰة او الانزال ان صح انها نزلت بمکة حین فرضت الصلوة و بالمدینة لما حولت القبلة و قد صح انها مکیة لقوله تعالیٰ و لقد أتیناک سبعاً من المثانی و هو مکی۔

ترجمہ قرآن مجید میں تفصیلاً جو چیزیں بیان ہیں یا وہ احکام نظریہ ہیں یا احکام عملیہ اور ان احکام پر عمل ہی جادۂ مستقیم پر گامزنی ہے۔ اور یہیں سے اہل سعادت کے مراتبِ عالی اور بندگانِ شقاوت کا تنزل وانحطاط معلوم ہوتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مزید نام کنز، وافیہ، کافیہ وغیرہ ہیں، اس کا نام سورۂ حمد بھی ہے، سورۂ شکر بھی سورۂ دعاء بھی۔ تعلیم المسئلۃ بھی، کیوں کہ خداوند تعالیٰ سے سوال کرنے اور مانگنے کا طریقہ اس سورت میں تعلیم کیا گیا ہے، سورۂ صلوٰۃ بھی اسے کہتے ہیں، اس لیے کہ اس کی قرأت نماز میں یا واجب یا مستحب ہے، شافیہ و سبع مثانی بھی اس کے نام ہیں، اس سورت میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں، ہاں کچھ حضرات تسمیہ کو ایک مستقل آیت شمار کرتے ہیں اور انعمت علیہم کو آیت نہیں کہتے، اور بعض اس کا عکس کرتے ہیں، بعض حضرات اسے مثانی کہنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کا نماز میں تکرار ہوتا ہے یا اس کا نزول مکرر ہوا ہے، اولاً مکہ میں اور ثانیاً مدینہ میں۔ قرآن مجید میں ولقد اٰتیناك سبعاً من المثانی یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں مکہ میں سبع مثانی کے نزول کی اطلاع دی گئی، تو یقیناً سورۂ فاتحہ مکی ہوگی۔

تشریح: قاضی صاحبؒ نے احکامِ نظریہ وعملیہ کا تذکرہ کیا، ان کی تشریح یہ ہے کہ جن چیزوں سے صرف ذات کی معرفت مقصود ہو، جیسے عقائد، انہیں احکام نظری کہتے ہیں۔ اور جہاں مقصد صرف عمل ہو، معرفت ذات پیش نظر نہ ہو، وہ احکام علمی کہلاتے ہیں جیسے اسلام کے جملہ احکام، مصنفؒ نے اس موقعہ پر اللتی هی

سلوك الطريق المستقيم کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس کے بارے میں بعض شارحین کی رائے یہ ہے کہ قاضی صاحب اس سے عملی احکام کی جانب اشارہ کرر ہے ہیں، اور اطلاع علی مراتب السعداء الخ سے احکام نظری کی جانب اشارہ دے رہے ہیں، اس تشریح کے پیش نظر ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کے تمام مضامین پر اجمالاً رہنمائی کرتی ہے، جن کا حاصل احکام عملی ونظری ہے، عملی احکام سے صراط مستقیم پر چلانا مقصود ہے اور نظری احکام کا مقصد خوش نصیب وسیاہ بخت انسانوں کے احوال ومراتب پر اطلاع، مگر بعض شارحین اس تشریح کو مناسب و برجستہ نہیں کہتے، ان کا خیال ہے کہ اگر یہ تشریح قبول کی گئی تو سلوک طریق مستقیم میں عقائد کی ضرورت نہ رہی اور مراتب سعادت وشقاوت میں عمل کی احتیاج نہ رہی، حالاں کہ دونوں ضروری ہیں، چوں کہ طریق مستقیم کا سلوک ممکن نہیں، جب تک کہ عقائد درست نہ ہوں اور سعید وشقی کو پہچاننا دشوار ہے تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ کونسا کام موجب سعادت ہے اور کونسا سبب شقاوت ہے؛ اس لیے یہ شارحین کہتے ہیں کہ اللتی کو معانی کی صفت قرار دے کر ہر ایک کو دونوں کا بیان کہا جائے اللتی کے بعد تفیں مقدر ہوگا اور اس میں جو ضمیر ہے، وہ معانی کی طرف لوٹے گی، ترجمہ یہ ہوگا کہ: سورۂ فاتحہ معانیٔ قرآن یعنی احکام نظری وعملی پر مشتمل ہے اور ان معانی کا نتیجہ راہِ راست پر چلنا اور سعادت وشقاوت کے مراتب پر اطلاع ہے، اس کے بعد قاضی صاحب نے سورۂ فاتحہ کے کئی نام ذکر کر کے وجوہِ تسمیہ کی جانب مختصر اشارے کیے ہیں، جن کی جانب خاکسار ابتداء میں کچھ اشارے کر آیا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق نماز میں قرأت کو جو واجب یا مستحب قاضیؒ نے بتایا وہ اس لیے کہ حضرت امام شافعیؒ سورۂ فاتحہ کی قرأت نماز میں فرض کہتے ہیں، جب کہ امام ابوحنیفہؒ مستحب یعنی غیر فرض قرار دیتے ہیں، قاضیؒ نے مستحب سے امام اعظمؒ کے مسلک کی جانب اشارہ کیا ہے اور یہ لفظ غیر فرض کے معنی میں استعمال ہے، تو واجب پر بھی شامل ہوگا کہ وہ فرض نہیں ہے، ہر دو امام کے دلائل فقہی کتب میں تفصیل سے ملیں گے۔

قاضی صاحبؒ نے سورۂ فاتحہ کا ایک نام سبع مثانی بیان کرتے ہوئے کچھ اختلافی مسائل کی جانب اشارہ کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سبع مثانی دو لفظوں سے مرکب ہے، سبع تو اس لیے کہ اس میں سات آیتیں ہیں بسم الله پہلی آیت الحمد لله رب العالمين دوسری، الرحمان الرحيم تیسری، مالك يوم الدين چوتھی، اياك نعبد واياك نستعين پانچویں، اهدنا الصراط المستقيم چھٹی اور صراط الذين الخ ساتویں۔

یہ ان کے خیال کے مطابق تشریح ہے، جو بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔

اور جو بسم اللہ کو جزء سورۂ فاتحہ نہیں مانتے، ان کے خیال میں پہلی آیت الحمد لله رب العالمين ہے

اورصراط الذین انعمت علیھم آیت ششم اورغیر المغضوب علیھم ولاالضالین آیت ہفتم۔

غرض یہ کہ ہر دوخیال پرآیات سورۂ فاتحہ کل سات ہی بنتی ہیں، اس لیے سبع کہنا بالکل درست ہےاور یہ اتفاق جمہور علماء کا ہے، اس لیے حسن بصریؒ وجعفیؒ کے اقوال بحوالہ ابن کثیرؒ جوابھی پیش کیے گئے تھے جن میں آیات سورۂ فاتحہ آٹھ بتائی گئی ہیں، صحیح تحقیق بھی نہیں، اورشاذ قول ہونے کی بنا پرقاضی صاحبؒ کے ''بالاتفاق'' کی تصریح سے متصادم نہیں۔

سبع مثانی کا دوسرا جزء یعنی المثانی مثنی کی جمع ہے، جیسا کہ منھیؒ کی جمع مناھی آتی ہے، مثانی کا ترجمہ مکرر کی ہوئی چیز، چونکہ سورۂ فاتحہ نماز کی ہررکعت میں پڑھی جاتی ہے اور ہرنماز میں پڑھی جاتی ہے، اس کو مثانی کہا گیا یا اس کا نزول مدینہ ومکہ دونوں جگہ ہوا، اورمکرر ہوا، اس لیے مثانی کہتے ہیں۔

قاضی صاحبؒ کے انداز عبارت سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں سورۂ فاتحہ کا نزول ثانیاً مدینہ میں مشتبہ ہے، چونکہ انہوں نے اسلوب یہ اختیار کیا ہے اِنْ صَحَّ یہ تعبیر نزول فی المدینہ کی صحت کو متردد کردیتی ہے، مزید برآں یہ کہ مکہ میں اس کے نزول کو یہ کہہ کر وہ صحیح قرار دے رہے ہیں قد صح انھا مکیة بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ قاضی صاحبؒ کے خیال میں قرآن کے اجزاء جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے وہ مستقل سورت کی حیثیت رکھتے تو مکی ومدنی دونوں اعتبار سے۔ اگر سورۂ فاتحہ کا نزول مان لیا جائے تو سورۂ فاتحہ کا بالاستقلال دو سورتیں ہونا لازم آتا ہے، جو صحیح نہیں، مگر قاضی صاحبؒ کا یہ خیال چنداں صحیح نہیں؛ اس لیے کہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مدینہ منورہ میں سورۂ فاتحہ کا مکرر نزول باقاعدہ سورت کی حیثیت سے نہیں ہوا؛ بلکہ اس کے مضامین کی اہمیت ومطالب کی عظمت کی بنا پر مکرر نازل کیا گیا اور اس حیثیت کا نزول سورہ کے استقلال کا مقتضی نہیں ہے، بہرحال مکی ہونا یقینی ہے اور اس کی دلیل وہی آیت قرآنی "ولقد اٰتینٰك سبعاً من المثانی الخ" ہے، اس آیت کے نزول کے بارے میں بعض تفاسیر میں ہے کہ ابوجہل ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام سے مکہ واپس آیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ قحط سالی اور بھوک وافلاس کی شدت میں مبتلا تھے، قافلہ کو دیکھ کر آپ کی اور حضراتِ صحابہ کی طالبانہ نظریں اٹھنے لگیں، جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر ابوجہل سات قافلے اپنے پاس رکھتا ہے تو کیا ہوا، چونکہ وہ ایک دنیاوی سرمایہ سے زیادہ نہیں، آپ کو سات آیت عطا کی گئیں جو دارین کی فوز وفلاح سے قریبی تعلق رکھتی ہیں، اس لیے آپ کو عطا کردہ خزانہ ابوجہل کے قافلوں سے بہت گراں قدر ہے۔

یہ شانِ نزول بھی سورۂ فاتحہ کے مکی ہونے کو مضبوط کرے گا۔ چونکہ ابوجہل کا تعلق مکّہ سے ہے نہ کہ مدینہ

سے۔ نیز نماز مکہ معظّمہ میں آپ پر فرض ہوچکی تھی اور ڈیڑھ سال سے زائد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قبل الہجرت مکہ نماز پڑھتے رہے اور ادھر سورۂ فاتحہ کو جو نماز کے ساتھ ایک خصوصیت ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوچکی تھی۔ ورنہ ڈیڑھ سال کے طویل عرصہ کی یہ نمازیں بغیر سورۂ فاتحہ کے تسلیم کرنا ہوں گی جو صحیح نہیں۔

قاضی صاحبؒ کی عبارت تثنیٰ فی الانزال ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے نزول کا سلسلہ اب بھی ہے، حالاں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کائنات سے تشریف لے جانے کے بعد نزول قرآنی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ قاضی صاحبؒ نے ماضی میں پیش آمدہ واقعہ کو حال سے تعبیر کردیا۔ یعنی نزول مکرر تو سورۂ فاتحہ کا بدورِ نبوت ہوا تھا، جو ماضی کی ایک داستان ہے اور الفاظ وہ استعمال کر لئے گئے جن کا تعلق حال سے ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص خواب بیان کرتا ہے تو کہتا ہے کہ پھر میں دیکھتا ہوں۔ یہ صیغہ برائے حال ہے۔ حالانکہ ماضی اور گذشتہ دور میں اس نے خواب دیکھا تھا۔

ایک اشکال اور بھی ہوسکتا ہے وہ یہ کہ: سورۂ فاتحہ کو مثانی بطریق جمع نہ کہا جائے جب کہ ایک ہی سورت ہے اگرچہ نزول مکرر ہوا تو مثناۃ کہلائے جانے کی زیادہ مستحق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ: آیات چوں کہ متعدد ہیں اس لئے ''مثانی'' کہہ دیا گیا۔ اس موقعہ پر مکی و مدنی کی بھی قدرے تفصیل معلوم کرنا ضروری ہے۔

مکّی:۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور قبل الھجرۃ ہے۔ اور ہجرت کے بعد کا دور مدنی کہلاتا ہے۔

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ: قبل ہجرت جو اجزاء قرآن کے نازل ہوئے وہ مکی کہلائیں گے۔ اگرچہ ان کا نزول مکہ سے باہر ہوا ہو۔ اور ہجرۃ کے بعد نازل ہونے والے قرآنی اجزاء قرار دیئے جائیں گے خواہ نزول اندرونِ مدینہ یا بیرونِ مدینہ کہیں بھی ہو۔

ا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اگر اہل مکہ سے خطاب ہے تو سورت مکی کہلائے گی اگرچہ اس کا نزول کہیں ہوا ہو اور مدنی وہ سورتیں ہیں جن میں اہل مدینہ کو خطاب کیا گیا ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ مکہ میں نازل شدہ حصّہ مکی اور مدینہ میں نازل شدہ مدنی۔ بالعموم مکی سورتوں میں آغاز ''یاایّھا الناس'' کے ساتھ ہے اور بیشتر تردید کفر و شرک، یہودیت و نصرانیت کی ہے۔ بت پرستی کے پرخچے اڑائے گئے ہیں اور تقلید بالآباء کے نظریہ کو شکست وریخت کیا گیا ہے۔ آخرت کی یاددہانی کراتے ہوئے فکر آخرت و محاسبۂ آخرت کے تصورات کو بیدار کیا گیا ہے۔ جب کہ مدنی سورتوں کے عمومی مضامین نفاق کی جڑوں پر تیشہ زنی، منافقین کے بھیانک چہروں سے نقاب کشائی، احکام شریعت کا تسلسل، تعلیم جہاد، جہاد میں

اخلاص کا حکم، آخرت سازی، دنیاوی حکومت اور اس کے طور وطریق وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان سورتوں میں بیشتر آغازِ کلام "یَآ اَیُّھَا الذِیْنَ اٰمَنُوا" سے ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ مکی ومدنی سورتوں میں معنوی فرق ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

من الفاتحة وعليه قراء مكة والكوفة وفقهاء هما وابن المبارك والشافعي ﷺ وخالفهم قراء المدينة والبصرة والشام وفقهاء ها ومالك والاوزاعي ولم ينص ابو حنيفة ﷺ فيه بشيئٍ فظن انها ليست من السورة عنده وسئل محمد بن الحسن الشيباني عنها فقال مابين الدفتين كلام الله۔

ترجمہ:۔ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ اور یہی رائے مکہ وکوفہ کے قراء، فقہاء عبداللہ بن مبارک اور الشافعی الامام کی ہے۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قاری اور یہاں کے فقہاء امام مالکؒ اور امام اہل شام عبدالرحمن الاوزاعی یہ سب بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں مانتے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے متعلق کوئی ایسی وضاحت نہیں ملتی۔ جس سے معلوم ہو کہ آپ کی رائے اس اختلاف میں کیا ہے۔ اس عدم وضاحت سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ابوحنیفہ بھی بِسۡمِ اللّٰہِ کو سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں مانتے۔ حالاں کہ ان کے مشہور شاگرد امام محمدؒ کی تصریح ہے کہ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آیا بِسۡمِ اللّٰہِ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟ تو فرمایا کہ جو کچھ قرآن میں ہے قرآن ہی کا حصہ ہے۔

تشریح:۔ اس سے پہلے کہ ہم قاضی صاحب کی عبارت کو حال کریں، استعاذہ یا تعویذ کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے چوں کہ قاضی صاحب نے اس پر توجہ نہیں کی، حالاں کہ قبل التسمیہ استعاذہ کا حکم خود قرآن مجید سے ثابت ہے:

فاذا قرات القرآن فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم یا امّا ینزغنّك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه هو السميع العليم۔

اس کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں جن میں ابلیس کے خفیہ فریب وباطنی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ الواحد القہار کی پناہ تلاش کرنے کا حکم ہے۔ تو پھر قاضی صاحب نے تعوذ پر کوئی گفتگو نہیں فرمائی دراں حالیکہ امت کا معمول بھی یہی ہے کہ تلاوت قرآن کا آغاز "اعوذ باللہ" سے ہوتا ہے اور بسم اللہ سے اس کے بعد۔

لعله ترك بحث استعاذة لان فيها ليس اختلاف الفقهاء كما وقع الاختلاف في التسمية بينهم۔ اقول ان اجبت هذا جوابًا عن القاضي ﷺ من نفسي ولكن هذا التاويل غير معقولٍ لان في الاستعاذة اختلاف ايضًا وان لم يكن هذا الاختلاف في الجزئية وعدمها ولكن الاختلاف

اھم و فلذا اقتحم نفسی فی ھذا المبحث۔

استعاذہ کب ہوگا؟

بعض حضرات کی رائے ہے کہ استعاذہ بعد التلاوۃ ہوگا، ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں فاذا قرآت القرآن ہے جو قرأت قرآن کے بعد استعاذہ کا حکم دے رہی ہے کما ھو الظاھر من فاستعذ باللہ۔ یہ رائے حمزہ کی ہے۔ ابو حاتم سجستانی نے حمزہ کے بارے میں یہی نقل کیا ہے بلکہ بعض حضرات نے یہ خیال خود ابو ہریرہؓ کی جانب بھی منسوب کیا۔ رئیس التابعین ابراہیم نخعیؒ اور غیر مقلدین کے امام ابو داؤد ظاہری کا بھی یہی خیال بتایا گیا ہے۔ قرطبیؒ نے مالک علیہ الرحمہ کا بھی یہی قول ذکر کیا ہے۔

قرطبی خود مالکی المذہب ہیں اور ان کی وضاحت بسلسلۂ اقوال مالکؒ جاندار ہے، لیکن ابن عربی المالکی نے قرطبی کی اس تصریح کو قبول نہیں کیا بلکہ لکھا ہے کہ امام مالکؒ کا ہرگز یہ خیال نہیں۔ رازیؒ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ استعاذہ اول و آخر قراءت ہر دو موقعہ پر ہونا چاہئے۔ چوں کہ دلائل دونوں جانبوں پر موجود ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ قراءت و تلاوت جبکہ خوش الحانی و تدبّر کے ساتھ ہو تو نفس میں اعجاب کی کیفیت پیدا ہونا متوقع ہے۔ خود تلاوت اہم ترین عبادت ہے اور عبادت کی ادائیگی پر ابلیس ایک کبر کی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ مجھے اتنی بڑی عبادت کی توفیق ہوئی، حالانکہ توفیق من اللہ ہے لا من نفس التالی والقاری، اس لئے استعاذہ بعد التلاوۃ ہونا چاہئے۔ لیکن جمہور کی رائے ہے بلکہ معمول یہی ہے کہ استعاذہ تلاوت سے پہلے ہو قال الجمہور معنی فاذا قرآت القرآن۔ اذا اردت القراءۃ کما فی قولہ تعالیٰ اذا قمتم الی الصلوٰۃ ای اذا اردتم الصلوٰۃ۔ نیز اس مقصد کے لئے کچھ احادیث بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ استعاذہ قبل التلاوۃ ہوگا نہ کہ بعد التلاوۃ، چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام من اللیل فاستفتح صلاتہ و کبّر ویقول اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم الخ اس مقصد کی روایتیں سنن اربعہ، مسند ابویعلیٰ وغیرہ میں ہیں ان احادیث کی تفصیل آپ کو کتاب الاذکار و فضائل الاعمال میں مل جائیں گی۔

استعاذہ واجب ہے یا مستحب؟

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ مستحب ہے، واجب نہیں، تاہم اس کو ترک کرنے والا گنہ گار ہوگا۔ عطاء بن ابی رباح کی رائے ہے کہ استعاذہ واجب ہے جب بھی تلاوت و قراءت کرے پڑھنا ضروری ہوگا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اول تو خدا تعالیٰ نے امر کا صیغہ استعمال فرمایا فاستعذ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

اسے ہمیشہ پڑھتے رہے اور یہ بھی کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے، شیطان کا دفع کرنا واجب ہے۔ ایک واجب کو حاصل کرنے کے لئے دوسری چیز بھی واجب ہوگی۔

بعض اہل علم کی رائے ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر استعاذہ واجب تھا، امت پر نہیں، ابن سیرین کہتے ہیں کہ عمر میں اگر ایک بار بھی کسی نے استعاذہ کرلیا تو فرضیت استعاذہ ادا ہوگئی۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص کچھ لکھوا رہا ہے تو بہتر یہ ہے کہ تعوذ بھی لکھوائے، اگر بجائے لکھوانے کے دل ہی دل میں پڑھتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

نماز میں استعاذہ بخیال امام ابوحنیفہؒ تلاوت کے لئے ہے اور ان کے شاگرد ابو یوسفؒ کی رائے ہے کہ یہ نماز کے لئے ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق مقتدی کو پڑھنا ہوگا، حالاں کہ ان کے خیال میں وہ قراءت نہیں کرے گا۔ فتویٰ امام اعظم کے قول پر ہے۔

لطیفہ: استعاذہ منھ کی طہارت ہے جو کچھ آدمی نے لغو گوئی کی ہے اور اس کے باطنی اثرات مرتب ہوئے تعوذ ان گندے اثرات سے منھ کو دھو دیتا ہے۔ تعوذ میں خدا تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی بے پناہ قدرتوں کا اقرار اور اپنی بندگی کا اعتراف ہے، گویا کہ بندہ نے یہ تسلیم کرلیا کہ مقابلہ کی مجھ میں ہمّت نہیں، خدا تعالیٰ ہی اس کے حملوں سے محفوظ کرسکتا ہے۔

قاضی صاحب نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء قرار دے کر فقہ شافعیؒ کی نمایندگی کی ہے، جب کہ حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں۔ دلائل آگے آتے ہیں۔

جہاں تک سورۂ نمل کا تعلق ہے اس میں تسمیہ سورۂ نمل کا جزء ہے لیکن ہر سورۃ کی ابتداء میں کیا بِسۡمِ اللّٰه جزء ہے یا نہیں۔ یہی مسئلہ اختلافی ہے۔

امام مالکؒ اور متقدمین احناف کی رائے ہے کہ تسمیہ قرآن ہی کا جزء نہیں۔ سورۂ فاتحہ سے جزئیت کا تعلق تو بعد کی چیز ہے، اسی لئے امام مالکؒ نماز میں جہراً اور سرًّا بسم اللہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

اور احناف قرآن کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر منقول ہوا، اور جس کے نقل و تواتر میں کوئی شبہ بھی نہیں۔ یہ بلا شبھۃ کی قید بسم اللہ کو قرآن کا جزء ماننے سے کارہ ہے چونکہ بسم اللّٰہ کی جزئیت کا مسئلہ مشکوک ہوگیا۔ لیکن احناف کا وہ طبقہ جسے متاخرین کہا جاتا ہے بِسۡمِ اللّٰه کو قرآن ہی کا جزو مانتا ہے۔ اور اس حد تک احناف و شوافع میں کوئی اختلاف نہیں۔

اختلاف یہاں سے شروع ہوا کہ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟ تو حنفیہ کی رائے میں یہ جزو فاتحہ

نہیں ہے۔شوافع جزء ماننے کے باوجود اس میں مختلف ہیں کہ کسی اور سورۃ کا بھی جزء ہے یا نہیں۔بعض شوافع کا خیال ہے کہ سب سورتوں کا جزء ہے جبکہ بعض کی رائے میں صرف سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔قاضی صاحبؒ نے دو دعوے بیک وقت کئے ہیں۔یعنی تسمیہ کی جزئیتِ قرآن نیز جزئیتِ فاتحہ۔

قرّاءِ مدینہ، بصرہ، شام، امام اوزاعی اور امام مالک سورۂ فاتحہ کا بھی جزو نہیں مانتے، اور دوسرا دعویٰ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، الحاصل قاضی صاحب اور علامہ تفتازانی کی تصریحات ایک دوسرے کی متضاد ہیں، چونکہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں کہ:

متقدمین احناف بِسۡمِ اللہ کو قرآن ہی کا جزو نہیں مانتے۔

اور قاضی صاحب کی وضاحت یہ ہے کہ:

قرآن کا جزو تسلیم کر کے سُورَۃُ فاتِحہ کے جزو ہونے نہ ہونے میں احناف کا اختلاف ہے۔

قاضی صاحبؒ کی تصریح احناف کے مسلک کے موافق ہے۔چوں کہ امام ابوحنیفہؒ کا وطن کوفہ ہے، کوفہ میں یہ عام شہرت تھی کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے۔مسئلہ اہم تھا، امام اعظمؒ کی مخالف یا موافق رائے سامنے آنا چاہئے تھی، لیکن کوئی رائے سامنے نہیں آئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں سکوت کیا۔آپ کی اسی خاموشی کو بعض لوگ سمجھ رہے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ تسمیہ کو سُورَۃُ فاتِحہ کا جزء قرار دیتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ قرآن کا تو یہ جزء ہے، تو اس میں امام محمدؒ کا یہ جواب کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ قرآن ہے اور بسمِ اللہ قرآن میں ہے۔لہٰذا قرآن کا بلاشبہ جزء ہے۔

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن کا آغاز بِسۡمِ اللہ سے کیا ان کے عہد میں بسم اللہ قرآن میں لکھی گئی اس لئے جزء قرآن ہونے میں اس کے کوئی شبہ نہیں۔

ولنا احادیث کثیرۃ منھا روی ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ انہ علیہ الصلوٰۃ السلام قال فاتحۃ الکتاب سبع آیات اولٰھن بسم اللہ الرّحمن الرّحیم وقول ام سلمۃ رضی اللہ عنہا قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الفاتحۃ وعدّ بسم اللہ الرّحمن الرّحیم الحمد للہ ربّ العٰلمین أیۃ ومن اجلھما اختلف فی انھا أیۃ برأسھا او بما بعدھا والاجماع علی ان مابین الدفتین کلام اللہ والوفاق علی اثباتھا فی المصاحف مع المبالغۃ فی تجرید القرأن حتیٰ لم یکتب آمین۔

ترجمہ:۔ ہمارے موقف کی تائید میں بہت سی احادیث ہیں: ایک روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُورَۃُ فاتِحہ کی سات آیتیں ہیں پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ایک اور حدیث حضرت اِم سلمہؓ کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ

پڑھی اور بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العلمین کو ایک شمار کیا۔ روایات کی بنا پر یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ آیا بسم اللہ مستقل آیت ہے یا یہ کہ مابعد سے مل کر آیت بنتی ہے؟ امّت کا اس پر عام اتفاق ہے کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قرآن مجید ہے۔ نیز پورا امّت ہمیشہ سے بسم اللہ کو قرآن میں لکھتی رہی حالانکہ امت کی یہ جدوجہد ہے، تھی اور رہے گی جو کچھ چیز قرآن میں سے نہ ہوا سے قرآن میں ہرگز نہ لکھا جائے۔ اسی لئے آمین بھی نہیں لکھی جاتی۔

تشریح:۔ قاضی صاحب شوافع کے اس مسلک پر کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے دو حدیثیں پیش کرتے ہیں ایک روایتِ اَبُوھریرہؓ دوسری روایتِ حضرت ام سلمہؓ۔ دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے۔ اگر چہ ایک روایت بتاتی ہے کہ بسم اللہ مستقل آیت ہے اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل آیت نہیں۔ بلکہ اپنے مابعد سے مل کر آیت بنتی ہے۔

ان دونوں روایتوں کے علاوہ قاضی صاحب اجماعِ امت سے بھی کام لے رہے ہیں جو مستقل حجت ہے اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ مابین الدفتین کلام اللہ ہے اور بسم اللہ دفتین میں ہے تو وہ بھی قرآن مجید ہی کا جزو ہوئی۔ مزید ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بسم اللہ ہمیشہ قرآن مجید میں لکھی جاتی ہے۔ اگر یہ قرآن سے نہ ہوتی تو ہرگز اسے نہ لکھا جاتا۔ چوں کہ امّت کا ہمیشہ سے یہ اہتمام رہا کہ غیر قرآن کو قرآن میں لکھنے سے احتیاط کی جائے۔

یہ ہے حاصل قاضی صاحب کی اس بحث کا جو انہوں نے کی ہے۔ لیکن اس پر ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ قاضی صاحب کو اصل بحث اس پر کرنی چاہئے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں؟ یہ قاضی صاحب کے پیش نظر نہیں کہ بسم اللہ قرآن مجید کا جزو ہے یا نہیں۔ لیکن قاضی صاحب نے جو دلائل حدیث کے علاوہ دیئے ہیں وہ سورۂ فاتحہ کا جزو ثابت کرنے میں ہرگز مفید نہیں۔

بعض شارحین نے قاضی صاحب پر وارد اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے یہ جواب دیا ہے کہ قاضی صاحبؒ اصلاً اپنے مقصد و مسلک شوافع کو ثابت بھی کرنا چاہتے ہیں نیز اپنے مخالفین کی تردید ان کی مقصود ہے تو حدیثوں سے وہ مسلکِ شوافع کی کھل تائید حاصل کر رہے ہیں اور بعد کے دو دلائل یعنی اجماع و اتفاق مخالفین کی تردید کے لئے۔ چوں کہ قراء مدینہ وغیرہ نے بسم اللہ کو قرآن سے نہیں مانا، اس لئے مصنف ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

مابین الدفتین میں سورتوں کے نام، ہر سورۃ کی تعداد آیات، تعداد رکوع، حروف کی تعداد، سورۃ کا مکی یا مدنی ہونا موجود ہے تو کیا یہ سب چیزیں بھی قرآن ہوں گی؟ قاضی صاحبؒ کی عبارت پر اشکال ہوسکتا ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ دورِ صحابہ وتابعین میں تیار قرآن کے نسخوں میں یہ سب تفصیلات نہیں تھیں اور مصنف کے پیشِ نظر اسی دور کے قرآن کے نسخے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ ما بین الدفتین میں "ما" مایحتمل فیہ انہا من القرآن کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مذکورہ بالا چیزیں قرآن میں شمار نہیں بلکہ یہ خارجی تفصیلات ہیں اس لئے قاضیؒ کی عبارت پر اعتراض صحیح نہ ہوگا۔

شوافع کے مسلک، ان کے دلائل سے واقفیت کے بعد احناف کے دلائل بھی سن لیجئے! مسلک حنفیہ کا اس باب میں وہی ہے کہ بسم اللہ قرآن کے اجزاء میں ہے لیکن سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔

چوں کہ بخاری و مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے، حضرت انسؓ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ میں ان میں ہوں جنہیں خوش قسمتی سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو معزز خلفاء کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، لیکن میں نے ان میں سے کسی کو نہیں سنا کہ جہری نمازوں میں بسم اللہ کو جہراً پڑھا ہو۔

حضرت انسؓ کے اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بسم اللہ سورہؑ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، اگر جز و ہوتا تو جیسے سورہؑ فاتحہ کا جہر کیا جاتا ہے بسم اللہ کو بھی بالجہر پڑھنا چاہئے تھا، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک حدیث قدسی، (حدیثِ قدسی حدیث کی وہ قسم ہے جس میں معانی والفاظ دونوں من جانب اللہ ہوتے ہیں، حدیث قدسی اور قرآن میں فرق یہ ہے کہ نماز میں ادائیگیٔ فریضۂ قراءۃ کے لئے قرآن کا پڑھنا ضروری ہے، حدیث قدسی سے کام نہیں چلے گا۔ حالاں کہ حدیث قدسی اپنے زور وقوت میں عام حدیثوں سے زیادہ قوی ہے، اگر چہ قرآن سے مرتبہ میں کم ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور دقیق فروق بھی ہیں جنہیں جاننے کے لئے تبریز اردو ترجمہ برائے ابریز از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا مطالعہ مفید تر ہے۔ یہ حضرت عبدالعزیز دبّاغ کے ملفوظات کا اردو ترجمہ ہے اور اہم علمی مسائل پر مشتمل ایک لطیف تالیف ہے۔)

حدیثِ قدسی کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ مجھ میں اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم ہے، چنانچہ جب بندہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کہتا ہے تو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: حمدنی عبدی، رحمان ورحیم پر فرمایا جاتا ہے اثنیٰ علّی عبدی یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اس حدیث میں آغاز بجائے الحمد کے بِسْمِ اللہ سے ہونا چاہئے۔

مزید برآں احمد ابن حنبلؒ کے مسند میں یہ روایت ہے جسے مشہور صحابی ابن مغفلؓ کے صاحبزادے

عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور میں نے سورۂ فاتحہ کے جہر کے ساتھ بسم اللہ کو بھی جہراً پڑھ ڈالا۔ میرے والد نے یہ سن لیا تو نماز سے فراغت پر والد نے مجھے ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا "ایاك والبدعة وایاك ان تحدث فی الاسلام شیئاً" بدعت سے بچو اور اسلام میں کسی نئی بات کا اضافہ مت کرو۔ میں نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، شیخین وحضرت عثمان کی اقتدا میں نمازیں پڑھی ہیں، ان میں سے کوئی بھی بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھتا تھا۔

ابن مغفل کا یہ بیان واضح کرتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جز نہیں، شوافع کی جانب سے پیش کردہ دلائل از قبیل احادیث کا جواب یہ ہے کہ:

ام سلمہ کی روایت میں آں حضور کا بسم اللہ کو پڑھنا برائے حصول برکت ہے، نہ کہ بارادہ تلاوت۔ نیز ام سلمہ کی روایت ضعیف ہے، اس لئے کہ عمر بن ہارون البلخی اس کے راوی ہیں اور وہ ضعیف ترین روای شمار کئے گئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر شافعی المذہب ہونے کے باوجود روایت ام سلمہ پر تنقید کر رہے ہیں، اور رہی راویتِ ابو ہریرہ تو ان کی دو روایتیں ہیں۔ ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ کا جہر کیا، اور ایک روایت سے بسم اللہ کے جہر نہ کرنے کی اطلاع ملتی ہے۔

اس لئے یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی متعارض ہونے کی وجہ سے نا قابلِ عمل ہیں، حافظ ابن کثیر نے تصریح کی ہے کہ خلفاء اربعہ، تابعین اور تبع تابعین سے بسم اللہ کا عدم جہر ثابت ہے، صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کی یہ روایت بھی ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آغازِ نماز تکبیر اور قرأۃ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" سے ہوتا۔ مسلم میں یہ بھی ہے جس کے رواى عبداللہ بن مغفل ہیں "لایذ کرون ای الرسول وخلفاءہ بسم الله الرّحمن الرّحیم فی اول قرأۃ ولا فی اٰخرھا"۔

بسم اللہ کی عدم جزئیت کا مذہب صرف امام ابو حنیفہ کا نہیں بلکہ سفیان ثوری واحمد بن حنبل کا بھی یہی قول ہے، امام مالک تو ان سے بھی آگے ہیں وہ بسم اللہ جہراً و سراً دونوں طرح پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

اس وقت راقم الحروف کے سامنے ابن کثیر ہے جنہوں نے ظاہر ہے کہ شافعی المذہب ہونے کی بنا پر حنفیہ کے دلائل کا اخفاء نہیں کیا، تفسیر مظہری واحکام القرآن للجصّاص، روح المعانی وغیرہ میں حنفیہ کے دلائل سیر حاصل ہوں گے ان شاء اللہ۔

* * *

(قسط اول)

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی؟

علامہ سید سلیمان ندویؒ

ہمارے آریہ دوستوں کو تعجب ہے کہ ایک ہزار سال کے اندر ہندوستان میں جہاں ایک بھی کوئی مسلمان نہ تھا، سات کروڑ مسلمانوں کی تعداد کیوں کر پیدا ہو گئی؟ لیکن کیا ان کو کبھی اس پر تعجب آیا ہے کہ ہندوستان جہاں کبھی ویدک دھرم مطلق نہ تھا، ہندوستان قدیم کی کروڑوں پرانی قومیں کیوں کر اس دھرم میں آ گئیں پھر بودھ مذہب نے اسی سرزمین میں ویدک دھرم کو کیوں کر شکست دی، اور بعد ازیں ویدک دھرم نے بودھ مذہب کو آگ، تلوار اور زبان سے کیوں کر نیست و نابود کر دیا؟ یہ سب پرانی باتیں ہیں، ان کو جانے دیجئے، چند صدیاں پہلے ایک عیسائی بھی نہ تھا، مگر اب یہاں نصف کروڑ کے قریب عیسائی آبادی پیدا ہو گئی ہے، اور روز بروز پیدا ہوتی جارہی ہے، یہ کیوں کر؟

عیسائی مشنریوں نے تمام دنیا میں یہ پھیلا رکھا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا ہے، حالاں کہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ رومی سلاطین نے عیسائی مذہب کی اشاعت میں کیا کیا نہ کیا۔ اسپین، پرتگال، روس، ہالینڈ نے خصوصاً اور یورپ کی عام سلطنتوں نے اس کے لئے کیا کیا راہیں نہ اختیار کیں، اور خود ہندو راجہ دھرم کی خاطر کیا کیا نہ کر گذرے، اسی طرح اگر بعض مسلمان بادشاہوں سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں تو صرف وہی سرزنش اور ملامت کے مستحق کیوں؟۔

تمام دنیا کے مذہب میں صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے یہ فلسفہ دنیا میں ظاہر کیا ہے کہ مذہب یقین کا نام ہے اور یقین تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک سے پیدا نہیں کیا جا سکتا: لا اکراہ فی الدین (سورہ بقرہ: ۲۵۶) مذہب میں کوئی زبردستی نہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ ہوئی ہے: افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (سورہ یونس: ۹۹)۔

اے پیغمبر! کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان والے ہو جائیں۔

خدا نے فرمایا: پیغمبر کا کام جبر و اکراہ نہیں بلکہ صرف دعوت اور تبلیغ ہے: لست علیھم بمصیطر (سورہ غاشیہ: ۲۲)۔ اے پیغمبر! تو ان کافروں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فانما علیک البلاغ (سورہ آل عمران: ۲۰) اے پیغمبر! تجھ پر صرف تبلیغ ہی فرض ہے۔

قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ اس کے مذہب کی تبلیغ دنیا میں کیوں کر کی جائے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (سورہ نحل: ۱۲۵)۔

اپنے رب کے راستہ کی طرف تو لوگوں کو دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا اور ان سے مناظرہ کر تو اس طریقہ سے جو بہترین ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا تو کارلائل کے اس سوال کا کیا جواب ہے کہ "اگر محمد نے تیغ زن سپاہیوں کے زور سے اسلام کو پھیلایا تو پہلے ان تیغ زن سپاہیوں کو کس تلوار سے مسلمان بنایا" اس اصول کی بنا پر تو چاہئے تھا کہ ان ملکوں میں اسلام کا سایہ بھی نہ پڑتا، جہاں تلوار نے اس کا ساتھ نہیں دیا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ملک حبش پر مسلمانوں نے اس کے اس احسان کے بدلہ میں کبھی تلوار نہیں اٹھائی کہ اس نے ایک دفعہ اسلام کے ابتدائی سخت مصیبت کے وقت میں مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، تاہم آج وہاں نصف آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے ان خطوں میں جہاں مسلمان سپاہیوں کا گذر بھی نہیں ہوا تھا، وہاں حلقہ بگوشان اسلام کی اتنی بڑی تعداد نظر کیوں آتی ہے، چین پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی مگر تین چار کروڑ مسلمان وہاں کہاں سے آ گئے، جزائر، ملایا، مسلمان سلاطین کی تاخت وتاراج سے ہمیشہ محفوظ رہے، مگر آج وہاں چار کروڑ مسلمان کس طرح پیدا ہو گئے، سیام، انام اور مشرق اقصیٰ کے دوسرے ملکوں اور جزیروں میں جہاں کسی مسلمان سپاہی کا قدم بھی نہیں پہونچا اسلام کا قدم وہاں کیوں کر پہنچ گیا؟ ترک وتاتار نے تو خود مسلمانوں پر تلوار چلائی تھی ان پر تلوار کس نے چلائی؟ اور ان کو کس نے مسلمان بنایا؟۔

دوسرے ملکوں کو جانے دو، خود ہندوستان کو لو! یہاں اسلامی فتوحات کا سیلاب درہ خیبر سے ہوکر آیا اور پنجاب سے کبھی آسام تک پہنچ گیا مگر درحقیقت ان کی قوت کا مرکز صوبہ آگرہ، دہلی، اودھ، بہار اور دکن رہا مگر دیکھو کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں آج بھی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے، یعنی آٹھ سو برس کے بعد بھی وہاں پندرہ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکے۔ برخلاف اس کے جہاں ان کا اقتدار حکومت زیادہ مضبوط نہ تھا وہاں وہ حیرت خیز کثرت رکھتے ہیں، بنگال، کشمیر اور سندھ جیسے دوردست اطراف میں ان کی تعداد اپنے ہمسایوں سے مافوق ہے۔

دکن پر مسلمانوں کا ہمیشہ قبضہ رہا، بہمنی سلطنت پوری قوت سے مسلط تھی، اس کے بعد پانچ اسلامی سلطنتیں معاصرانہ قائم ہوئیں، اور اس وقت بھی ان کے بڑے رقبہ پر ایک اسلامی سلطنت حکمراں ہے، تاہم وہاں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے۔

سب اہلِ تاریخ جانتے ہیں کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کو کلی طور سے کوئی مسلمان بادشاہ زیر نہ کر سکا، انگریزوں کے عہد تک وہاں کے ہندوؤں کے ہاتھوں میں مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ کے لئے تلواریں تھیں، مگر بایں ہمہ وہاں کی کوئی ریاست آج ایسی نہیں، جہاں تھوڑے بہت مسلمان نہ ہوں، سیلون اور برما پر کبھی مسلمانوں نے قبضہ نہیں کیا، مگر وہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان گذشتہ واقعات کو بھی جانے دو، انگریزی عہد کے پرامن زمانہ کو سامنے لاؤ، اب تو ہندوستان میں مسلمانوں کی ''بے نیام تلوار'' ہمیشہ کے لئے کند ہوگئی ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد کی پہلی مردم شماری سے لے کر ۱۹۲۱ء کی مردم شماری تک کی ہر دہ سالہ تعداد کو دیکھو کہ مسلمان ستر اسی برسوں میں پانچ کروڑ سے سات کروڑ کے قریب کیوں کر پہنچ گئے، ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد یہاں پانچ کروڑ ستر لاکھ تھی، ۱۹۰۱ میں ۶ رکروڑ ۲۵ رلاکھ ہوگئی، اور ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ۶ رکروڑ ستر لاکھ ہوگئی، تیس برس کے عرصہ میں ایک کروڑ مسلمان کس محمود اور عالمگیر کی تلوار کی فتوحات ہیں، اور آج بھی ملک کے ہر گوشہ میں نئے مسلمانوں کا اضافہ ہو رہا ہے، وہ کس جابرانہ قوت کا اثر ہے؟

ہمارے آریہ دوستوں کو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت پر سخت استعجاب اور حیرت ہے، اور اس کے اسباب و وجوہ کے جاننے کے لئے سخت بے چینی ہے، اور بے خبری یا تعصب سے وہ کبھی اس کا بڑا سبب غزنوی کی تلوار اور کبھی عالمگیر کے مظالم کو قرار دیتے ہیں، ذیل کے صفحات میں ہم ان کے سامنے سے حقیقت کا پردہ اٹھانا چاہتے ہیں، تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ہندوستان میں اسلام کی ترقی انہیں طبعی طریقوں سے ہوئی ہے جن سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے اور ہوگی۔

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا سب سے پہلا اور قدیم سبب عربوں اور ہندوؤں کا تجارتی میل جول تھا، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں میں باہم تعلق نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھا، بلکہ اس کا آغاز اسلام سے بہت پہلے ہو چکا تھا، البتہ اسلام کے بعد عرب قوم کی تنظیم نے ان تعلقات کو اور زیادہ مستحکم اور مضبوط کر دیا، اب عرب تاجر پہلے کی طرح صرف رومی مال و اسباب اور عربی مصنوعات و پیداوار ہی ہندوستان میں نہیں لانے لگے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنی سب سے بڑی دولت اور اپنی سب سے قیمتی متاع جو عرصہ میں اس پیغمبر عربی کے وسیلہ سے ان کو ملی تھی، وہ بھی رفتہ رفتہ اپنے ساتھ لانے لگے، اور یہاں سے اب وہ صرف مسالوں، خوشبوؤں، تلواروں اور کپڑوں کا سامان ہی نہیں لے جانے لگے، بلکہ نومسلموں کی کچھ تعداد بھی اپنے ساتھ لے جانے لگے، ملیبار، سندھ، گجرات، کچھ، کوکن، سواحل بنگال، اور جزائر ہند کی قوموں نے ان کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر قبول کیا، عربی سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں میں ان مقامات کے نام اور حالات بکثرت مذکور ہیں۔

ملیبار میں موپلا اور نوایت انہی عرب تاجروں کی یادگار نسل ہیں، اور یہی ہندوستان میں اسلام کی

اشاعت کے سب سے پہلے داعی اور مبلغ ہیں، انہوں نے جس آہستگی، سکون اور خاموشی سے اس فرض کو انجام دیا، عیسائی مشنری اور انگریزی مؤرخین تک ان کی اس قابلیت کے مداح اور ستائش گر ہیں۔

ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے، سندھ کا علاقہ مدت دراز سے شاہان ایران کا باج گذار تھا، اور جاٹ اور میڈی قوم کے لوگ ان کی فوج کے سپاہی تھے، اس کے بعد جب ایران کا تخت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، تو گذشتہ سلطنت کے ترکہ کے طور پر سندھ کے تعلقات ان کو ہاتھ آئے، اور اس وقت سے لے کر محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ تک والی عراق اور رایانِ سندھ کے درمیان صلح وشکست کے واقعات پے در پے پیش آتے رہے، محمد ابن قاسم کی فتوحات کی وسعت جو بلوچستان اور کراچی سے لے کر ملتان تک تھی، بہت جلد ختم ہوگئی، یعنی اس نے سو برس کا زمانہ بھی نہیں پایا ہے، لیکن اسلام کی مذہبی فتوحات کا سیلاب بدستور جاری رہا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا تیسرا مشہور راستہ درہ خیبر کا ہے، جدھر سے وہ اپنی پیدائش سے چار سو برس کے بعد محمود غزنوی کی تیغ خاراشگاف کے سایہ میں داخل ہوا۔

اگر ہمارے آریہ دوستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستان مذہبی حیثیت سے پہلے بھی ویسا ہی تھا جیسا آج ایک زمانہ سے وہ نظر آتا ہے، کہ ویدک دھرم نام ایک برہمنی مذہب کو ہر باشندۂ ہند کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، عرب میں اسلام کی پیدائش اور ہندوستان میں بودھ مذہب کا زوال ساتھ شروع ہوا، تاہم اس کو مٹتے مٹتے بھی ایک زمانہ لگ گیا، عرب مسلمان جب ملیبار، سیلون، سندھ، گجرات اور کوکن وغیرہ میں آئے ہیں تو ان کا مقابلہ ویدک دھرم کے ہندوؤں سے نہ تھا، بلکہ بودھ مت اور جین مت کے پیروؤں سے تھا، اس وقت ترکستان سے کابل تک اور پنجاب وکشمیر سے سندھ تک بودھ مت اور گجرات وغیرہ ادھر کے ساحلی علاقوں میں جین مت غالب تھا(۱)

اور ملیبار اور مدراس کے اطراف میں ویدک دھرم یا برہمنی مذہب کے پیرو لوگ نہ تھے، بلکہ زیادہ تر ہندوستان کے پرانے باشندے تھے، جن کو درۂ خیبر سے آنے والے مغرور برہمنوں نے ہندوستان سے نکال دیا تھا، یا وہ خود سے بھاگ کر دور دست علاقوں میں چلے گئے تھے، ہندوستان کے حدود میں اسلام کا پہلا قدم جنوبی ہند میں پڑا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملیبار کے راجہ نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، یعنی ایک رات اسکو چاند شق ہوکر دکھائی دیا، اس نے ادھر ادھر لوگوں کو تحقیق حال کے لئے بھیجا، بالآخر معلوم ہوا کہ عرب دیس میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے، اور اس نے معجزہ دکھایا ہے، راجہ یہ سن کر مسلمان ہوگیا، اور عرب چلا گیا، ایک روایت میں ہے کہ وہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہنچا، دوسری روایت میں ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں پہنچا، اور بالآخر یمن میں اس نے انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوا۔ **(جاری)**

حدیث اور علوم حدیث

ایک تعارف

حضرت مولانا محمد اسلام قاسمی
استاذ حدیث وادب دار العلوم وقف دیوبند

حدیث کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

لغت عرب کے امام علامہ جوہریؒ نے صحاح میں حدیث کے معنی اس طرح بیان کئے ہیں کہ ''الحدیث الکلام قلیلہ وکثیرہٗ و جمعہ احادیث'' یہ حدیث کے لغوی معنی ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث لغت کے اعتبار سے ہر قسم کے کلام کو کہا جاتا ہے، اور حدیث کے اصطلاحی معنی میں علماء کی مختلف عبارتیں ہیں، لیکن یہ اختلافِ اقوال یا تولفظی ہے، یا اعتباری، اس موضوع پر سب سے بہترین علامہ طاہر بن صالح الجزائریؒ نے اپنی کتاب ''توجیہ النظر فی اصول الاثر'' میں کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ دراصل حدیث علماء اصول فقہ کی اصطلاح میں کچھ اور ہے اور محدثین کی اصطلاح میں کچھ اور، اس لیے دونوں کی بیان کردہ تعریفوں میں فرق ہوگیا ہے۔

اصولیین کے نزدیک حدیث کی تعریف یہ ہے ''اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہٗ'' اس تعریف میں تقریر بھی داخل ہے، اس لئے کہ افعال کا لفظ اس کو بھی شامل ہے، اسی طرح آپ کے احوال اختیاریہ بھی افعال کے لفظ میں داخل ہوجاتے ہیں، البتہ اس تعریف کی رُو سے وہ روایات حدیث کی تعریف میں نہیں آتیں، جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال غیر اختیاریہ کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً آپ کا حلیۂ مبارک، آپ کی ولادیت یا وفات کے واقعات کا بیان، لیکن علماء اصول فقہ کے نقطۂ نظر سے ایسی روایات کا حدیث کی تعریف سے خارج ہوجانا کچھ مضر نہیں، کیوں کہ علماء اصول فقہ کا مقصد حدیث سے استنباط احکام ہے۔

اس کے برخلاف حضرات محدثین آپ کے احوال اختیاریہ وغیر اختیاریہ میں کوئی فرق نہیں کرتے، اور ان کا مقصود استنباط احکام نہیں، بلکہ ہر اُس روایت کو جمع کردینا ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف کسی بھی حیثیت سے منسوب ہو، اس لئے ان کے نزدیک حدیث کی تعریف یہ ہے "اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ واحوالہ" اب یہ تعریف احوالِ غیر اختیاریہ کو بھی شامل ہوگئی۔

بعض علماء کے نزدیک لفظ حدیث میں جدت کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس طرح حدیث قدیم کی ضد ہے، وہ قدیم سے کتاب اللہ اور جدید سے حدیث رسول مراد لیتے ہیں، ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح البخاری میں فرماتے ہیں: شرعی اصطلاح میں حدیث سے وہ اقوال واعمال مراد ہیں، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہوں، گویا حدیث کا لفظ قرآن کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، اس لیے کہ قرآن قدیم ہے اور حدیث اس کے مقابلے میں جدید ہے، اسی طرح سے حافظ سخاویؒ لفظ حدیث کو قدیم کی ضد مانتے ہیں، اور لغوی اور اصطلاحی تعریف یوں کرتے ہیں "**والحدیث لغة ضد القدیم، واصطلاحاً ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قولا له او فعلا او تقریرا او صفةً حتی الحرکات و السکنات فی الیقظة والمنام**" (فتح المغیث ص ۱۲)

حدیث وسنت:

اگر ہم محدثین بالعموم اور متاخر محدثین بالخصوص کی غالب رائے پر عمل کریں تو حدیث وسنت کے الفاظ کو مترادف ومساوی پائیں گے، یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں، اور ان دونوں کا مفہوم کسی قول، فعل، تقریر یا صفت کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرنا ہے، البتہ اگر حدیث وسنت کے الفاظ کو ان کے اصول تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان دونوں کے استعمال میں لغت واصطلاح کے پیش نظر کچھ دقیق سا فرق بھی پایا جاتا ہے۔

حدیث وسنت کا فرق:

لفظ سنت اپنی اصل کے پیش نظر لفظ حدیث کے مترادف ومساوی نہیں ہے، اپنے اصل لغوی معنی کے اعتبار سے سنت کا اطلاق اس دینی طریقے پر کیا جاتا تھا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرت مطہرہ میں گامزن رہے، اور لفظ حدیث عام ہے، اس میں آں حضور کے اقوال واعمال سب داخل ہیں، برخلاف سنت کا لفظ آپ کے اعمال کے ساتھ مختص ہے۔

علم الحدیث کی تعریف:

یہ تو صرف حدیث کی تعریف تھی، علم حدیث کی تعریف میں بھی علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

علامہ بدرالدین عینیؒ نے "عمدۃ القاری" میں علم حدیث کی یہ تعریف نقل کی ہے، "**علم یعرف به**

اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و افعالہ و احوالہ" اور حافظ سخاویؒ نے "فتح المغیث" میں یہ تعریف کی ہے "معرفۃ ما اضیف الی النبی قولا لہ او فعلا او تقریرا او صفۃ" یہ دونوں تعریفیں بظاہر جامع ہیں، لیکن اُن پر اشکال یہ ہے کہ اس میں احادیث موقوفہ و مقطوعہ شامل نہیں ہوتیں، حالاں کہ علم حدیث میں تو اُن سے بھی بحث کی جاتی ہے، اس اشکال سے بچنے کے لیے "فتح الباقی شرح الفیۃ العراقی" میں علم حدیث کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "معرفۃ ما اضیف الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او الی صحابی او الی من دونہ قولا او فعلا او صفۃ او تقریرا" یہ تعریف اگرچہ جامع ہے، کیوں کہ احادیث موقوفہ و مقطوعہ کو بھی شامل ہے، لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ یہ مانع نہیں ہے، کیوں کہ اس میں من دونہ کے الفاظ بہت عام ہیں، جو صحابہ و تابعین کے علاوہ ملوک و امراء اور بعد کے لوگوں کو بھی شامل ہیں، اُن کی وجہ سے علم تاریخ بھی علم حدیث میں شامل ہوجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تعریف کا منشاء بھی یہ تھا کہ علم تاریخ کو علم حدیث میں شامل رکھا جائے اور یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ دراز تک علم حدیث اور علم تاریخ میں کوئی فرق نہ تھا، اسی وجہ سے حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں اور شیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے "کشاف اصطلاحات الفنون" میں علم حدیث کی جو تعریف ذکر کی ہے اس کی رُو سے علم تاریخ بھی اس میں داخل ہوجاتا ہے، انھوں نے لکھا ہے "جملۃ الاخبار المرویات حدیث"، لیکن یہ بات اُس وقت تک درست تھی جب تک علم حدیث اور علم تاریخ ایک ہی تھے، اور جب تک دونوں علیحدہ و مدوّن نہیں تھے، لیکن جب بعد میں علم تاریخ کو بالکل مستقل حیثیت حاصل ہوگئی تو علم حدیث کی تعریف ایسی ہونی چاہئے جو تاریخ کو شامل نہ ہو، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسی تعریف مذکورہ بالا میں ایک قید کا اضافہ کرکے یوں کہا جائے کہ "ھو معرفۃ ما اضیف الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او الی صحابی او الی من دونہ ممن یقتدی بھم فی الدین قولا او فعلا او صفۃ او تقریرا" اس قید سے بادشاہوں اور غیر علماء کے واقعات علم حدیث کی تعریف سے خارج ہوجائیں اور مقتدی حضرات کے واقعات داخل رہیں گے۔

انواع علم الحدیث:

علم حدیث کی ابتداءً دو قسمیں ہیں: (۱) علم روایت الحدیث۔ (۲) علم درایۃ الحدیث۔

علم روایۃ الحدیث کی تعریف یہ ہے "ھو علم بنقل اقوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم و افعالہ و احوالہ بالسماع المتصل و ضبطھا و تحریرھا"۔

اور علم درایۃ الحدیث کی تعریف یہ ہے کہ "ھو علم یتعرف بہ انواع الروایۃ و احکامھا و شروط الرواۃ و اصناف المرویّات و استخراج معانیھا"۔

لہٰذا کسی حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ فلاں کتاب میں فلاں سند سے فلاں الفاظ کے ساتھ مروی ہے، یہ علم روایۃ الحدیث ہے، اور اس حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ خبر واحد ہے یا مشہور، صحیح ہے یا ضعیف، متصل ہے یا منقطع، اس کے رجال ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، نیز اس حدیث سے کیا کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں، اور کوئی تعارض تو نہیں ہے، اگر ہے تو کیوں کر رفع کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب باتیں علم درایۃ الحدیث سے متعلق ہیں۔

یہ درایۃ الحدیث کی وہ قسم ہے جس کو اصول حدیث سے بھی تعبیر کرتے ہیں، لیکن حقیقتاً دونوں مترادف نہیں ہیں، دراصل اصول حدیث الگ علم ہے، جس میں روایت کی اسنادی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے اور درایۃ الحدیث کی دوسری قسم علم فقہ الحدیث ہے، جس میں کسی حدیث سے احکام ومسائل مستنبط کئے جاتے ہیں۔

فقہ اسلامی:

علوم حدیث کے تحت آنے والی درایۃ الحدیث کا ایک حصہ وہ ہے جسے علم فقہ الحدیث سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں احادیث کے ذخیرے سے مستنبط احکام ومسائل سے بحث ہوتی ہے، اور اسی سے اسلامی فقہ کی بنیاد پڑتی ہے، تاہم فقہ اسلامی کے مفہوم کی زیادہ وضاحت کے لیے ذیل کی تشریح پیش خدمت ہے۔

فقہ اسلامی کا مفہوم:

فقہ کے لفظی معنی سمجھ بوجھ اور کسی چیز میں درک حاصل کرنا ہے، قرآن پاک اور حدیث نبوی میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا، اس کے اس لفظی معنی میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ دین کے معاملہ میں سمجھ بوجھ رکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا قرآ مجید میں ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذرھم قومھم اذا رجعوا الیھم (التوبۃ)

کیوں نہ ہر قوم سے کچھ لوگ تفقہ فی الدین یعنی دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں تاکہ وہ علم دین حاصل کر کے واپس ہوں تو اپنی قوم کو اس سے آگاہ کریں۔

حدیث میں آیا ہے: "**من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین**"، جس کو اللہ تعالیٰ بھلائی دینا چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے۔

عہد صحابہ وتابعین تک جب بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا تو اسے یہی دینی فہم مراد لیا جاتا تھا، جس میں عقائد، عبادات، اخلاق ومعاملات سب داخل سمجھے جاتے تھے، مگر جب ہر فن کی جدا جدا تدوین شروع ہوئی تو ہر فن

کے لیے جدا جدا اصطلاحیں وضع ہوئیں، اس وقت سے علم فقہ سے عقائد و اخلاق کی بحث کو علیحدہ کرلیا گیا اور فقہ کا دائرہ عبادات و معاملات اور معاشرت کے ظاہری احکام تک محدود ہوگیا، اور ان احکام کے جو اخلاقی و روحانی پہلو میں آہستہ آہستہ فقہ کی کتابوں میں ان سے بحث کرنا ترک ہوگیا، اور ان تینوں شعبوں کے عملی احکام کو جاننے ہی کا نام ''علم فقہ'' ہوگیا، عقائد کی بحث کے لیے علم کلام وجود میں آیا، اور احکام کے اخلاقی و روحانی پہلو یعنی احسان اور تزکیۂ نفس کے لیے تصوف کی اصطلاح وضع ہوئی، مثلاً ابتدا میں نماز کے بیان میں اس کے ظاہری ارکان کے ساتھ خشوع و خضوع اور انابت قلب کا بھی ذکر ہوتا تھا، مگر بعد میں فقہ میں نماز کے ظاہری ارکان کی تفصیل سے بہت زیادہ بحث ہونے لگی، مگر اس کے روحانی اور اخلاقی پہلو پر بہت کم بحث ملے گی۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، ابتدا میں ''فقہ فی الدین'' کا لفظ نفس دین اور سارے دینی احکام میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے بولا جاتا تھا، خواہ وہ ایمان و عقیدہ کے مسائل ہوں یا قانونی احکام ہوں، یا اخلاقی اور روحانی ہدایات ہوں، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ جن کی ذات گرامی سے فقہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا انھوں نے فقہ کی تعریف یہ کی تھی، ''**معرفة النفس ما لها و ما علیها**'' ہر شخص یہ جان لے کہ اس کے لیے دنیا و آخرت میں کیا چیز مفید ہے اور کیا چیز مضر ہے۔

اس تعریف سے فقہ کا دائرہ محض عملی احکام تک محدود نہیں رہتا، بلکہ عقائد و اخلاق اور احسان و تزکیہ کے احکام بھی اس میں داخل ہوجاتے ہیں، علامہ ابن نجیم نے اپنی کتاب البحر الرائق میں عام فقہاء کی طرف فقہ کے صرف چار شعبوں عبادات، مناکحات، معاملات اور عقوبات کے مسائل لکھے ہیں، مگر انھوں نے عقائد و آداب کو بھی فقہ کا جز قرار دیا ہے، البحر الرائق کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ کے پانچ شعبے ہیں (۱) اعتقادات (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) مزاجر (۵) آداب۔ اور ان میں سے ہر شعبے کی پھر کئی قسمیں ہیں، مثلاً اعتقادات میں ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتاب، ایمان بالرسول، ایمان بالآخرہ وغیرہ اس کی قسمیں ہیں۔ اسی طرح عبادات کی بھی پانچ قسمیں ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد، معاملات کی بھی پانچ قسمیں ہیں۔ معاوضات مالیہ، مناکحات، مخاصمات، امانات، شرکات، مزاجر، یعنی وہ احکام جن میں جرائم اور ان کی سزاؤں کا بیان ہو۔ اس کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ مثلاً قتل کی سزا (قتل میں کسی عضو کو نقصان پہنچا دینا بھی شامل ہے) کسی کا مالی حق لینے کی سزا، مثلاً چوری، ڈاکہ، غصب، بے عزتی کی سزا، آبرو ریزی کی سزا۔ گویا سارے فوجداری قوانین اس کے تحت آجاتے ہیں۔ آداب جس میں رہنے سہنے، کھانے پینے کے طریقے اور ذاتی اخلاق و سیرت کی بحث ہوتی ہے، فقہ میں عام طور پر ان میں سے تین شعبوں سے بحث کی جاتی ہے، یعنی عبادات، معاملات، مزاجر (البحر الرائق ص ۷ ج ۱)

اس تفصیل سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلامی فقہ ک دائرہ کتنا وسیع ہے، اس کی گرفت سے انسانی زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں ہے، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ جب مختلف فنون کی تقسیم شروع ہوئی تو فقہاء نے فقہ کے مجرد عملی احکام کو عقائد اور اخلاق کی بحث سے جدا کرلیا اور پھر انھوں نے فقہ کی یہ تعریف کی۔

"العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ"

فقہ نام ہے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے جاننے کا۔

عام طور پر علمائے احناف مثلاً بزدوی، ابن نجیم، ابن عابدین، اور المجلہ کے مولفین نے دو ایک لفظ کے اضافہ کے ساتھ یہی تعریف لکھی ہے، شافعی فقہاء میں علامہ آمدی نے اسی کی یہ وسیع تعریف کی ہے

"الفقہ مخصوص بالعلم الحاصل بجملۃ الاحکام الشرعیۃ بالنظر و الاستدلال"

فقہ اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بصیرت و دلیل کے ساتھ شریعت کا علم حاصل ہو۔

صاحب ہدایہ کے دور تک تو فقہاء ہر مسئلہ میں ادلہ تفصیلیہ (یعنی یہ کہ فلاں مسئلہ کتاب وسنت کے فلاں حکم سے ماخوذ ہے) سے بحث کرتے رہے، مگر بعد میں مجرد احکام سے بحث شروع ہوگئی، دلائل کو نظر انداز کر دیا گیا، متاخرین فقہاء میں علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور ملا علی قاری نے شرح النقایہ میں اس کا اہتمام کیا ہے، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے بھی شرح وقایہ کے حاشیہ میں اس کا اہتمام کیا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں علوم حدیث میں تنوع:

اس صدی میں علم حدیث کا کام تدوین کے لحاظ سے اپنے عروج کو پہنچا، اور اسانید طویل ہوگئیں، ایک ایک حدیث کئی کئی طریقوں سے روایت کی جانے لگی، علم کے وسعت کے لحاظ سے جہاں فن حدیث کی مختلف کتابیں تصنیف کی گئیں، وہیں مصنفات کی مختلف قسمیں بھی ہوئیں۔

انواع المصنفات:

کتب حدیث کی اپنے موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے، بہت سی اقسام ہیں، جن میں سے ہر ایک قسم کا ایک خاص اصطلاحی نام ہے، مختصراً چند قسموں کا تذکرہ ذیل ہے:

(۱)الصحیح (۲)الجامع (۳)السنن (۴)المسند (۵)المعجم (۶)المستدرک (۷)المستخرج (۸)التجرید (۹)التخریج (۱۰) کتب الجمع (۱۱)الفھارس (۱۲)الاربعینات (۱۳)الاطراف (۱۴)غریب الحدیث (۱۵)العلل (۱۶)مشکل الحدیث (۱۷)الموضوعات۔

کتب حدیث کے طبقات:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے صحت، ضعف اور موضوع ہونے کے لحاظ سے پانچ طبقے قرار دیئے ہیں۔

(۱) **طبقۂ اولیٰ:** احادیث کی وہ کتابیں جن میں ان کے مصنفین کے خیال کے مطابق صحیح درجہ سے کم تر احادیث نہ ہوں۔ اس میں مؤطا امام مالک، بخاری شریف اور مسلم شریف بلاشبہ امت کے نزدیک صحیح احادیث کے مجموعے ہیں۔ اسی زمرے میں مستدرک حاکم اور جامع ابن حبان آتے ہیں۔

(۲) **طبقۂ ثانیہ:** حدیث کی وہ کتابیں جن میں صحیح، اور حسن درجہ کی احادیث ہوں اور اگر کہیں ضعیف حدیث مروی ہو تو اس کے ضعف کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہو، اس طبقے میں سنن نسائی، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن دارمی، اور مسند امام احمد بن حنبل لائق ذکر ہیں۔

(۳) **طبقۂ ثالثہ:** حدیث کی وہ کتابیں جن میں ہر طرح کی احادیث جمع ہوں، صحیح، حسن، ضعیف، منکر اور موضوع۔ اپنے حسن ترتیب کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ کا نام سب سے اوپر آتا ہے، اس کے علاوہ دار قطنی، سنن بیہقی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند طیالسی اور معاجم طبرانی آتے ہیں۔

(۴) **طبقۂ رابعہ:** وہ کتابیں جن میں زیادہ تر احادیث ضعیف ہوں، جیسے نوادر الاصول، الکامل لابن عدی، تاریخ الخلفاء للسیوطی، یا تاریخ بغداد لخطیب البغدادی۔

(۵) **طبقۂ خامسہ:** جن کتابوں میں صرف موضوع احادیث مذکور ہوں، تاکہ طالبان حدیث کو معلوم ہو جائے کہ یہ موضوع احادیث ہیں، جیسے الموضوعات الکبریٰ لابن الجوزی، اور اللآلی المصنوعہ للسیوطی وغیرہ

روایۃ الحدیث کے تحت آنے والے علوم:

(۱) **راوی:** جو شخص اپنی سند سے حدیث روایت کرتا ہو، خواہ مرد ہو یا عورت، اس کو راوی کہتے ہیں۔

(۲) **مروی:** روایت کردہ حدیث یا قول کو مروی کہتے ہیں۔ اس لئے مروی عام ہے، کہ وہ نبی کریم کی جانب منسوب ہو یا صحابہ و تابعین کی جانب۔

(۳) **احوال الراوی:** راوی کے حالات کا ذکر، جن سے اس کی روایت کی قبولیت یا عدم قبولیت پر بحث ہو۔

(۴) **احوال المروی:** اس سے مراد وہ شرائط ہیں جن کا تعلق حدیث کے اخذ و روایت اور سند کے متصل یا منقطع یا معضل ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔

درایۃ الحدیث کے تحت آنے والے علوم (اصولِ حدیث)

(۱) علم جرح وتعدیل: ان علوم میں سے جرح وتعدیل کا علم بھی ہے، یہ وہ علم ہے جو خاص الفاظ کے ذریعہ راویوں کی عدالت وثقاہت یا ان کے عیب وضعف سے بحث کرتا ہے۔ جرح وتعدیل کا علم درایت حدیث کے فن کا ثمرہ ہے، بہت سے علماء اس فن میں اثر صحابہ سے متأخرین کے عہد تک گفتگو کرتے چلے آئے ہیں۔

(۲) علم رجال الحدیث: اس علم میں حدیث نبوی کے راوی ہونے کے اعتبار سے رواۃ حدیث کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ اس علم میں مشغول ہونے والے اوّلین شخص امام بخاری تھے۔ دوم ابن سعد، سوم ابن الاثیر، چہارم ابن حجر عسقلانی

(۳) علم مختلف الحدیث: اس علم میں ان احادیث سے بحث کی جاتی ہے، جن میں بظاہر تناقض نظر آتا ہے، اس علم کے ذریعہ ان کے مابین جمع وتطبیق دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) علل الحدیث: اس علم میں ان پوشیدہ اور دقیق علل واسباب سے بحث کی جاتی ہے جن کی بنا پر حدیث کی صحت میں قدح وارد ہوتی ہے۔ مثلاً حدیث کا منقطع ہونا، یا موقوف کا مرفوع ہونا وغیرہ۔ اس موضوع پر ابن المدینی، امام مسلم، ابن ابی حاتم، دارقطنی اور ابن الجوزی نے کتابیں تحریر کی ہیں۔

(۵) غریب الحدیث: یہ علم ان احادیث سے بحث کرتا ہے جن کا مطلب ومفہوم بہت سے لوگوں پر عربی زبان کے بگڑ جانے کی وجہ سے واضح نہیں ہوتا۔

(۶) ناسخ ومنسوخ: یہ علم ان احادیث متعارضہ سے بحث کرتا ہے جن میں جمع وتطبیق کا امکان نہ ہو اور بعض احادیث کو ناسخ اور بعض کو منسوخ قرار دیا جائے۔ اور یہ کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی معلوم ہوتا ہے اور کبھی صحابہ کرام سے۔

اقسام حدیث:

ابتداءً حدیث کی دو قسمیں ہیں: (۱) حدیث مقبول (۲) حدیث مردود۔

مگر محدثین کے یہاں حدیث کی ایک ثلاثی قسم ہے، جن میں حدیث کی ساری قسمیں آجاتی ہیں۔

(۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف

اور اس کے علاوہ جو بھی حدیث ہو موضوع کے زمرے میں آئے گی۔ پھر ان تینوں قسموں کی الگ الگ ذیلی قسمیں بھی ہیں۔

جدید سائنس

اسلام کی ایک ادنی خادمہ

حضرت مولانا عمر فاروق لوہاروی صاحب

جدید سائنس اسلام کی ایک ادنی دست بستہ خادمہ ہے۔ اس سے اسلام کو خواہی نخواہی فائدہ پہنچ رہا ہے اور اسلامیات کو سمجھنے اور سمجھانے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے؛ چناں چہ استبعادِ عقلی کی بیساکھی کے سہارے مادہ پرستوں نے اسلامیات کی متعدد چیزوں کا انکار کیا تھا؛ لیکن سائنس جدید کی نت نئی ایجادات واکتشافات سے ان میں سے کئی چیزیں محسوس ومشاہد کا درجہ حاصل کر رہی ہیں اور ان کا استبعادِ عقلی ختم ہو رہا ہے؛ اسی لیے امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ جدید سائنس کو اقرب الی الاسلام قرار دیتے تھے۔ دار العلوم دیوبند (وقف) کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''ایک بار آپ (امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ) سے پوچھا گیا، کہ فلسفۂ قدیم اسلام سے زیادہ قریب ہے یا جدید سائنس، فرمایا کہ:

''سائنس جدید اقرب الی الاسلام ہے۔''

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ نئی تحقیقات سے اسلام کو سمجھنے میں جس قدر مدد ملتی ہے، اس کے پیش نظر آپ کا یہ ارشاد صرف توسع پر مبنی نہیں؛ بلکہ اس میں اصابت رائے کی پوری روشنی بھی موجود ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ معراج کو سمجھنے کے لیے کس قدر موشگافیاں کرنا پڑتی تھیں، مگر عصر حاضر میں جب انسان ایک کرہ سے دوسرے کرہ میں بے تکلف سفر کر رہا ہے، تو معراج کو سمجھنا اور سمجھانا لاینحل مسئلہ نہیں رہا۔

اعمال کے وزن کی اطلاع جو حدیث وقرآن میں مسلسل ملتی رہی۔ ''مقیاس الحرارۃ'' (تھرمامیٹر) کی موجودگی میں بقائمی ہوش وحواس وزن اعمال کا انکار کون کر سکتا ہے؟

اقوال کی حفاظت کے لیے موجودہ وقت کا ٹیپ ریکارڈ ایک بہترین ثبوت ہے۔'' (نقش دوام، ص: ۱۱۷، ۱۱۸)

حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا ملفوظ نقل فرماتے ہیں:

''قرآن مجید میں ہے، کہ اہل جنت و اہل جہنم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، پہچانیں گے اور باتیں کریں گے، حالاں کہ ان کے درمیان بہت غیر معمولی فاصلہ ہوگا، تو اب ٹیلیفون، لاسلکی تلغراف، ریڈیو اور ٹیلی ویزن کی ایجادات نے اس کو بھی قریب عقل و مشاہدہ کر دیا ہے۔

اصوات و اعمال کا ریکارڈ مستبعد سمجھا جاتا تھا؛ مگر گراموفون کی ایجاد نے اس سے بھی مانوس کر دیا، کہ حق تعالیٰ نے زمین اور اس کے متعلقات میں بھی اخذ و ریکارڈ کا مادہ ودیعت فرمادیا تھا، جس کو ہم یورپ کی ان ایجادات سے پہلے عقل و مشاہدہ کی رو سے نہ سمجھ سکتے تھے۔(ملفوظات محدث کشمیری، ص: ۹۴، ۹۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں، جن سے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائید دین کا کام لیا ہے، جو کافر ہیں، کہ وہ نئی نئی ایجادیں کر دیں، جن سے بہت سے شبہات حل ہو گئے۔

چناں چہ لوگوں کو شبہ تھا کہ قرآن مجید میں ہے: يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (الزلزال: ۴)

''اس روز زمین اپنی سب (اچھی بری) خبریں بیان کرنے لگے گی۔'') زمین کیسے بولے گی؛ کیوں کہ وہ جمادات میں سے ہے؟ اللہ نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرا دیا کہ یہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے۔ اب اس کو کس قسم میں داخل کرو گے، جو اس کے لیے نطق کو جائز رکھو گے؟

.... ظاہر ہے، کہ جمادات ہی میں سے ہے، تو جمادات کو بولنے کا استبعاد بھی ختم ہو گیا۔

(خطبات حکیم الامت، ص: ۱۷۵، ۱۷۶، ج: ۷)

'صحیح بخاری' میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِيْ هٰهُنَا؟ فَوَاللهِ مَا يَخْفٰى (لَا يَخْفٰى) عَلَيَّ خُشُوْعُكُمْ وَلَا رُكُوْعُكُمْ، إِنِّيْ لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِيْ.

صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب عظۃ الإمام الناس فی إتمام الصلاۃ وذکر القبلۃ، ص: ۵۹، ج: ۱، قدیمی: کراچی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا قبلہ ادھر ہے؟ (یعنی کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا رہا ہوں؛ اس لیے مجھے صرف اسی جہت میں نظر آتا ہے اور مجھے تمہاری کچھ خبر نہیں؟) اللہ کی قسم! مجھ پر نہ (سب ارکان میں) تمہارا خشوع (یا تمہارے سجدے) مخفی ہے اور نہ تمہارا رکوع۔ یقینا میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''

حدیث بالا میں مذکور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیٹھ کے پیچھے سے دیکھنے کو عقل پرستوں نے بعید سمجھا تھا، حالاں کہ اس میں عقلاً کوئی استبعاد نہ تھا؛ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''آئینہ میں صورت تب تک نظر آتی ہے، جب تک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو؛ کیوں کہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑ کر پھر رائی (: دیکھنے والے) کی طرف لوٹتی ہے؛ اس لیے صورت نظر پڑتی ہے۔ جب نگاہ نہ کی، تو شعاع نہ نکلی، تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے، وہ کوئی مبائن چیز نہیں؛ بل کہ اس چہرے پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے۔

جب مرئی (جس چیز کو دیکھا جائے) سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی، پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو کمان کی طرح موڑ سکے، تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا؛ چناں چہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سر نظر آنے لگتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے پیچھے سر میں دو سوراخ تھے، ان سے نظر آتا تھا، تو اس کی کوئی ضرورت نہیں؛ بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی۔ جب آپ قصد فرماتے، دیکھ لیتے۔ آگے کا قصد فرماتے، آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے، پیچھے نظر فرما لیتے، ہر شخص میں یہ قوت نہیں؛ اس لیے نظر نہیں آتا۔''

اور (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ) اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے تھے۔

(ملفوظات حکیم الامت، ص: ۱۹۸، ۱۹۹، ج: ۱۲)

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ دیکھنا بطور معجزہ تھا۔ ایسا ہی ثابت ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے۔ اور فلسفۂ جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قوتِ باصرہ تمام اعضاءِ انسانی میں ہے۔'' (ملفوظات محدث کشمیری، ص: ۳۴۲، ۳۴۳)

علامۂ موصوف نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

واعلم أن المتنورين الذين لا يؤمنون بآيات الله، وهم بهفوات اوربا يؤمنون، قد استبعدوا منطق الأعضاء في المحشر، مع أن زعمائهم قد أقروا اليوم بسريان الصر في سائر الجسد، فلا يستبعد منهم أن يقروا بسريان النطق أيضاً، ولو بعد حين۔

(فیض الباری، کتاب التفسیر، سورۃ الفرقان، باب قولہ: (اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ)، ص: ۲۱۸، ج: ۴، ط: المجلس العلمي: ڈابھیل)

''جان لو! وہ روشن خیال لوگ جو اللہ کی آیات کا یقین نہیں کرتے اور یورپ کی بیہودہ باتوں کا یقین کر لیتے ہیں، انہوں نے محشر میں اعضاءِ انسانی کے بولنے کو بعید خیال کیا؛ حالاں کہ ان کے زعماء اور لیڈر (آنکھ کے علاوہ) بقیہ اعضاء میں قوت باصرہ کے نفوذ وسرایت کرنے کا اعتراف کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی بعید نہیں کہ گویائی کے سرایت کرنے کا اعتراف بھی کر لیں؛ اگرچہ ایک عرصہ بعد سہی۔''

لیورپول کے رہائشی برطانوی فوجی کریگ لوندبرگ (CRAIG LUNDBERG) کی بہ عمر ۲۱ رسال ۲۰۰۷ء میں عراق میں اپنی خدمات کے دوران گرینیڈ لگنے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی۔ اس کے متعلق آج سے تقریباً آٹھ سال قبل ایک خبر ملکی وغیر ملکی اخبارات وغیرہ ذرائع ابلاغ کی زینت بنی تھی کہ اب وہ اپنی زبان کی مدد سے دیکھنے کی ٹیکنالوجی استعمال کرے گا۔ ''روزنامہ جنگ'' لندن بابت: ۱۶ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ بروز اتوار مطابق ۶ ستمبر ۲۰۰۹ء کے شمارے میں یہ خبر کچھ اس طرح شائع ہوئی تھی:

نابینا برطانوی فوجی زبان کی مدد سے دیکھنے کی ٹیکنالوجی استعمال کرے گا۔ اس ٹیکنالوجی پر مبنی آلہ برین پورٹ ویژن کہلاتا ہے اور اسے ایک امریکی کمپنی نے تیار کیا ہے۔

''لندن (پی اے) ایک نابینا برطانوی فوجی ملک میں پہلا شخص ہے، جو زبان کی مدد سے دیکھنے کی ٹیکنالوجی استعمال کر سکے گا۔ اس ٹیکنالوجی پر مبنی آلہ برین پورٹ ویژن کہلاتا ہے اور اسے ایک امریکی کمپنی نے تیار کیا ہے۔ یہ برطانوی فوجی جو اپنی خدمات کے دوران دونوں آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو گیا تھا، اس آلہ کی مدد سے اپنی روزمرہ کی زندگی آسانی سے گزار سکے گا۔ علم بصارت پر دفاعی مشیر ونگ کمانڈر روب سکاٹ نے بتایا، کہ نابینا فوجیوں اور شہریوں کے لیے یہ بڑی اہم ٹیکنالوجی ہے اور انہوں نے خود یونیورسٹی آف پیٹس برگ میڈیکل کے ایک دورے میں اس کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے کہا، کہ اس میں

ایک کیمرہ عینک کے دو شیشوں پر رکھا ہے، تاکہ بیرونی ماحول کو سکین کر سکے۔ یہ الیکٹروڈ ر سے منسلک ہے، جنہیں زبان پر رکھا جاتا ہے اور زبان بیرونی ماحول کو محسوس کرتی ہے، اگر کوئی مکمل نابینا آدمی کمرے میں آئے، تو وہ اس آلے کی مدد سے فرنیچر اور دوسری چیزوں کو دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔''

واضح ہو، کہ اب یہ برطانوی فوجی زبان کی مدد سے دیکھنے اور اپنی روزمرہ کی زندگی گزارنے لگا ہے، اس لحاظ سے زبان میں بھی قوت باصرہ ہونے کی یہ ایک زندہ مثال ہے۔ اسی طرح زمانے کے گزرنے کے ساتھ نئے تجربات ہوتے رہیں گے اور بقیہ اعضاء سے دیکھنے کی مثالیں بھی سامنے آتی رہیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صحیح بخاری، کتاب الجھاد، کتاب فضائل الصحابہ، کتاب اللباس اور کتاب الأدب میں مختلف طرق سے ایک روایت میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں کچھ کپڑے آئے، جن میں خز (ایک خاص قسم کا کپڑا) یا اون کی دھاری دار ایک سیاہ چھوٹی چادری بھی تھی۔ آپؐ نے حاضرین سے دریافت فرمایا، کہ تمہارا کیا خیال ہے، ہم یہ چادر کس کو دیں؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ام خالد کو میرے پاس لاؤ! ان کو (چھوٹی ہونے کی وجہ سے) اٹھا کر لایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے چادر لے کر اپنے دست مبارک سے ام خالد کو پہنایا: اوڑھایا اور (علیٰ اختلاف الروایتین) دو یا تین دفعہ فرمایا، کہ اسے پرانا اور بوسیدہ کرو (یعنی آپ ﷺ نے دعا دی، کہ تمہاری عمر اس قدر لمبی ہو، کہ تم اس کپڑے کو پہن پہن کر پرانا کر دو) اس چادر میں سبز یا زرد رنگ کے پھول تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان پھولوں کو دیکھ کر اپنے دست مبارک سے ام خالد کو اشارہ کر کے فرمانے لگے: یَا أُمَّ خَالِدٍ! هٰذَا سَنَاهُ! ''اے ام خالد! یہ عمدہ ہے!'' سَنَا حبشی زبان میں الحسن یعنی عمدہ کے معنی میں آتا ہے۔

اسحاق بن سعید راوی فرماتے ہیں، کہ مجھ سے خاندان کی ایک عورت نے بیان کیا، کہ اس نے وہ کپڑا ام خالد رضی اللہ عنہا پر دیکھا۔

عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ کپڑا باقی رہا، یہاں تک کہ راوی نے (طویل زمانہ کا) ذکر کیا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ کسی خاتون نے اتنی لمبی عمر نہیں پائی، جتنی ام خالد رضی اللہ عنہا

نے پائی (چناں چہ موسیٰ بن عقبہ نے ام خالد رضی اللہ کے علاوہ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو نہیں پایا ہے۔ فتح الباری)

اس حدیث پاک کے طرق مختلفہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کی برکت سے ام خالد رضی اللہ عنہا نے لمبی عمر پائی، یہاں تک کہ ان کی درازیٔ عمر کا لوگوں میں چرچا ہوا، اسی طرح ان کا کپڑا (قمیص یا چادر) طویل عرصہ تک ان کے زیر استعمال رہا۔ اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قول: (فبقيت حتى ذكرت) أي: بقيت تلك القميص، لم يخلقها مضي الليالي ومرور الأيام، ولعل تلك القميص أيضاً تكون تتوسع عليها بقدر جسدها فإنها إذا تقمصت كان صبية، فلا بدّ من الزيادة في القميص، ومن يؤمن ببقاء تلك القميص إلى زمن لم تخلق، لم يعجز عن الإيمان بسعتها أيضاً، وأما من لم يجعل الله له نوراً فما له من نور۔

(فیض الباری، کتاب الجهاد، باب من تكلم بالفارسية الخ، ص: ۴۵۸، ج: ۳، ط: المجلس العلمي: ڈابھیل)

''وہ قمیص باقی رہی، مرور ایام کے باوجود وہ بوسیدہ نہیں ہوئی، نہیں پھٹی اور بسا ممکن ہے کہ وہ قمیص بھی ام خالد کے جسم کے اعتبار سے بڑھتی اور کشادہ ہوتی رہی؛ اس لیے کہ جب انہوں نے قمیص پہنی تھی، تو وہ بچی تھی؛ لہٰذا قمیص کا بڑھنا ضروری ہے۔ جو شخص مدت دراز تک اس قمیص کے باقی رہنے کا یقین کرے گا، تو وہ اس کے بڑھنے اور کشادہ ہوتے رہنے کو ماننے سے پیچھے نہیں رہے گا، لیکن جس کو اللہ ہی نورِ یقین نہ دے، اس کو کہیں سے بھی نور میسر نہیں ہوسکتا۔''

چند ماہ قبل کی ایک نئی ایجاد نے جسم کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قمیص کے بڑھنے کو سمجھنا اور سمجھانا نہایت آسان کردیا۔ ''روزنامہ جنگ'' لندن میں شائع ہونے والی حسب ذیل خبر کو پڑھیے اور اپنے ایمان کو تازہ کیجیے:

بچوں کے ساتھ ساتھ بڑھنے والے کپڑے تیار

والدین بچوں کے لیے ہر چند ماہ بعد کپڑوں کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ ایک جانب تو اس

میں وقت ضائع ہوتا ہے، تو دوسری جانب مہنگے کپڑے خریدنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ چھوٹے بچوں کے کپڑے دو مرتبہ دھلنے کے بعد انہیں نہیں آتے؛ کیوں کہ چھوٹے بچے بہت تیزی سے بڑھتے ہیں؛ لیکن اب پیٹٹ پلی (PETIT PLI) یہ فرنچ زبان کا لفظ ہے، جس کا تلفظ ''پیٹی پلی'' ہے۔ عمر فاروق) نامی ایک کمپنی نے ایسا سمارٹ لباس بنایا ہے، جسے ایک مرتبہ خریدنے کے بعد دو سال تک بچوں کے لیے دوسرا لباس خریدنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پیٹٹ پلی (پیٹی پلی۔ عمر فاروق) کے مطابق پیدائش کے دو سال تک بچے سات مرتبہ جسامت بڑھاتے ہیں اور ان کے لیے سات مرتبہ کپڑے خریدنے پڑتے ہیں۔ اس کمپنی نے جو لباس بنایا ہے، وہ ۴ سے ۳۶ ماہ تک کے بچوں کے لیے فٹ بیٹھتا ہے۔ کمپنی کے سربراہ ریان ماریو یاسین (RYANMARIO YASIMN) پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں اور انہوں نے کہا، کہ بچے کو بار بار نیا سائز پہنا کر ہم زمین کے وسائل خرچ کر رہے ہیں اور دوسری جانب آبادی اس پر بڑی رقم خرچ کرتی ہے، ان کا تیار کردہ لباس واٹر پروف، ہوا پروف، پائیدار اور بار بار دھونے کے قابل ہے۔ اس لباس کے اندر خاص لچک دار میٹریل شامل کیا گیا ہے اور جب اسے کھینچا جاتا ہے، تو کپڑا پتلا ہونے کی بجائے موٹا ہو جاتا ہے اور یہ خاصیت بلٹ پروف لباسوں میں پائی جاتی ہے۔ اس ایجاد کو برطانیہ میں جیمز ڈائسن ایوارڈ دیا گیا ہے۔

(روزنامہ جنگ، لندن، بابت: بدھ، ۲۲ ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۲۰۱۷ء)

سائنس کی یہ ایجاد چوں کہ نئی نئی ہے، بالفاظ دیگر اس ایجاد میں سائنس خود بچّی ہے؛ اس لیے ۴/ماہ سے ۳/سال تک کے بچوں کے لیے مذکورہ لباس تیار کیا ہے۔ اس شعبہ میں سائنس جب جوان ہوگی، تو جوانی تک اور بوڑھی ہوگی، تو بوڑھاپے تک کارآمد لباس تیار کرے گی، اسی طرح دیگر شعبوں پر ہاتھ ڈالتی رہے گی، تو اسلام کی یہ خادمہ اسلامیات کے دوسرے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں مزید سہولت کار ثابت ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيزٍ۔

طلاقِ ثلاثہ بل کے نقصانات

حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

۲۸ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو لوک سبھا میں عورتوں کے تحفظ کے زیر عنوان ایک ایسے قانون کو منظوری دی گئی، جس کا تعلق خالص مسلمانوں سے ہے۔ اس کی زد براہِ راست شریعت پر پڑتی ہے، جو آئینِ ہند کے پورے طور پر منافی اور ناانصافیوں سے سراسر بھرا ہوا ہے۔ ملک کے آئین نے اپنے عوام کو مذہبی آزادی کے مکمل حقوق دیے ہیں، لیکن یہ قانون اس آزادی پر پوری طرح خنجر چلاتا اور آئین کی بالادستی کو ختم کرتا ہے۔

طلاق کا مقصد کیا ہے؟:

ہندوستان کے اس نئے نویلے قانون پر تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مقصدِ طلاق پر مختصر روشنی ڈال دی جائے۔ طلاق کے معنیٰ ''آزادی'' کے آتے ہیں۔ دو اجنبی مرد وعورت دو گواہوں کی موجودگی میں باہمی رضامندی سے ایجاب وقبول کے بعد ایک دوسرے کے لیے شریکِ حیات بن جاتے ہیں۔ یہ مرد وعورت کے درمیان زندگی کا سفر ساتھ ساتھ گزارنے کا ایک مقدس معاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرح ازدواجی زندگی کی شروعات ہوجاتی ہے۔

انسانی زندگی ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتی۔ کبھی حالات ایسے بن جاتے ہیں کہ میاں بیوی میں نباہ کی صورت کالعدم ہوجاتی ہے۔ ایسے وقت میں کبھی مرد چاہتا ہے کہ بیوی سے نجات پائے اور کبھی عورت چاہتی ہے کہ شوہر سے نجات ملے۔ کبھی دونوں ہی ایک وقت میں ایک دوسرے سے علیحدگی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اسلام نے سب کے لیے راستے کھلے رکھے ہیں۔ نباہ نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی اپنا یہ رشتہ ختم کرسکتے ہیں۔ یہی رشتہ ختم کرنا ''طلاق'' کہلاتا ہے۔ طلاق کے مختلف طریقے شریعتِ اسلامیہ میں بیان کیے گئے ہیں، جن میں سے طلاقِ رجعی، طلاقِ بائن، طلاقِ احسن اور طلاقِ بدعت زیادہ مشہور ہیں۔ طلاق کی ان ساری قسموں سے مرد وعورت کا ازدواجی رشتہ ختم کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں طلاق پسندیدہ چیز نہیں:

یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اسلام نے رشتے نبھانے کی زبردست تلقین کی ہے اور واضح پیغام دیا ہے

کہ اس رشتے کو چلانے کے لیے جس حد تک بھی کوشش کی جاسکتی ہو، کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تلخیوں کو ختم کرنے کے لیے متعدد کوششیں اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، جن میں افہام وتفہیم بھی داخل ہے۔ جب رشتہ چلنے کا کوئی امکان ہی نہ بچے تو طلاق کا راستہ رکھا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ جذبات میں طلاق نہ دی جائے، بلکہ پورے ہوش وحواس اور موقع محل دیکھ کر اپنے اس آخری راستے کو اختیار کیا جائے، چناں چہ کہا گیا ہے کہ حالتِ حیض میں طلاق نہ دی جائے، بلکہ پاکی کی حالت میں مرد اپنا یہ حق استعمال کرے۔ پاکی کا یہ دورانیہ ایسا ہو کہ مرد نے اپنی بیوی سے صنفی تعلق قائم نہ کیا ہو۔ اور طلاق بھی صرف ایک ہی دے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے ''طلاقِ احسن'' کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کا پڑھا لکھا اور دیندار طبقہ اسی طرح طلاق دیتا ہے۔ طلاق دینے کا یہ طریقہ سب سے شاندار ہے۔

طلاقِ بدعت سے پیغمبر ﷺ کی نفرت:

لیکن مسلمانوں کا جاہل طبقہ دین کا مناسب علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ ایک ساتھ تین دفعہ طلاق دی جائے، تبھی طلاق پڑتی ہے، تین سے کم طلاق پڑتی ہی نہیں، اسی نادانی کے سبب کچھ مسلمان ایسا کر گزرتے ہیں اور ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ طلاق کا یہ طریقہ شریعت کی زبان میں ''طلاقِ بدعت'' کہلاتا ہے۔ رشتہ ختم کرنے کا یہ راستہ انتہائی نامناسب اور موجبِ گناہ ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اس طریقے پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔

مگر طلاقیں پڑ جاتی ہیں:

اگلی بات سمجھنے کے لیے ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ ہر انسان کے یہاں قدرتی طور پر ماں باپ کا احترام پایا جاتا ہے۔ اولاد ان کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کو کسی طرح کی اذیت پہونچانا تو درکنار، اگر کسی نے غصے میں ''اف'' کہہ دیا تو بھی اس نے جرم ہی کیا۔ کون بندہ ہوگا جو اپنے ماں باپ پر گولیاں چلا دے، لیکن اگر خدانخواستہ کوئی بدنصیب گولی چلا دے اور ایک ساتھ تین تین۔ تو اگر چہ یہ عمل بہت بڑا جرم اور سنگین گناہ ہے، مگر یہ تینوں گولیاں اپنا کام کر جاتی ہیں اور متاثرہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں، پھر اس کے لیے آخری رسومات کے مراحل پیش آتے ہیں۔ کوئی یہ کہے کہ اگر چہ تین گولیاں ماں کو لگیں، مگر وہ کسی حال میں مر نہیں سکتی، کیوں کہ ماں کو گولی مارنا حرام اور سنگین جرم ہے، تو یہی کہا جائے گا کہ وہ اپنا دماغی علاج کرائے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، تین گولیاں جسم پر لگیں اور اس کی روح نکل گئی تو یہی کہیں گے کہ اس کی وفات ہوگئی ہے۔ حرام ہونا اپنی جگہ، مگر گولیوں نے تو اپنا کام کر ہی دیا۔ ٹھیک یہی حال تین

طلاقوں کا بھی ہے۔ اگر مرد نے اپنی بیوی کو ایک سانس میں تین طلاقیں دے دیں تو اگر چہ یہ گناہ کی بات ہے، مگر جب تین طلاقیں دے دیں تو تینوں پڑ گئیں۔ کوئی یہ کہے کہ تین طلاقیں دینا حرام ہے تو پھر پڑیں کیسے؟ تو جواب یہی ہوگا کہ ماں کو گولیاں مارنا بھی سنگین جرم ہے، مگر جب گولیاں چلا دیں تو وہ مر گئی۔ لوگوں کو سمجھنے میں یہیں دھوکہ ہوا ہے۔ ہندوستانی عدالت سے بھی یہی چوک ہوئی۔ کوئی وکیل اسے یہ مسئلہ سمجھا نہیں سکا، شاید وکیل نے خود بھی نہ سمجھا ہو۔

ہندوستان کا جدید قانونِ طلاق:

گزشتہ 28 دسمبر کو لوک سبھا میں تین طلاقوں کے مسئلے میں جو قانون پاس ہوا ہے، وہ ہر طرح غلط ہے۔ اس میں اگر چہ طلاقِ بدعت کا اطلاق ''ایک ساتھ میں تین طلاقوں'' پر کیا گیا ہے، مگر درحقیقت اس کے اثرات دور تک پہونچیں گے۔ اس قانون میں ہے کہ جو بھی طلاق فوری طور پر اپنا اثر دکھاتی ہو اور رشتہ بالکلیہ ختم ہو جاتا ہو، سب سنگین جرم ہے۔ اس قانون کی رو سے اوپر بیان کردی طلاقِ بدعت کے علاوہ حالتِ حیض میں دی جانے والی طلاق، اسی طرح طلاقِ بائن، نیز خلع سے طلاق نہیں پڑے گی۔ میاں بیوی کا رشتہ حسبِ سابق باقی رہے گا، علاوہ ازیں یہ سنگین جرم بھی مانا جائے گا۔ ایسے مرد کو تین سال جیل میں گزارنے پڑیں گے، بیوی بچوں کا نان نفقہ بھی اس کے ذمے ہوگا۔ غور کیا جائے تو یہ قانون عجیب وغریب اور سخت نا قابلِ فہم ہے۔ جب حکومت اسے طلاق مان ہی نہیں رہی تو اسے جیل کی سزا کیوں؟ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے۔ سزا جرم پر ہوتی ہے، جب طلاق پڑی ہی نہیں تو جیل کیوں؟ پھر وہ جیل پہونچ گیا تو وہ کمائے گا کیا اور بیوی بچوں کو دے گا کیا؟ اسلام کی رو سے جب تین طلاقیں دے دیں یا طلاقِ بائن دے دی تو میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو گیا۔ عدت تک تو عورت کا خرچ مرد کے ذمے ہے، مگر عدت کے بعد مرد بھی ہر طرح آزاد ہے اور عورت بھی۔ لیکن یہ قانون کہتا ہے کہ رشتہ باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صنفی تعلقات حسبِ سابق بنائے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام میں اس طرح کی طلاق کے بعد بغیر جدید نکاح کے صنفی تعلقات ''زنا'' کی فہرست میں داخل ہوں گے۔ زنا سخت ترین حرام ہے۔ اس قانون کی پیچیدگیاں دیکھ کر نئی نسلیں شادی سے کترائیں گی، ایسی پریشانی کون جھیلنا چاہے گا؟ نتیجتاً نسب سے محروم بچوں کی بہتات ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ یہ اللہ کے عذاب کا بھی ایک بہت بڑا سبب بنے گا، اسی لیے حکومت سے میری گزارش ہے کہ طلاق کے اس قانون کو ختم کر دے، تا کہ آئین کی روح بھی برقرار رہے، مذہبی آزادی بھی باقی رہے، ساتھ ہی شہریوں کی مشکلات کو بھی راہ نہ ملے۔

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمیؒ

ایک ہمہ جہت شخصیت

مولانا فضیل احمد ناصری

استاذ حدیث ونائب ناظم تعلیمات جامعہ ہذا

پیشِ لفظ

رواں ماہ کی 13 ویں تاریخ تھی، میں بہار میں منعقدہ ایک اجلاس کے لیے سفر پر نکل پڑا تھا، غازی آباد کے قریب پہنچا ہوں گا کہ اچانک واٹس ایپ کے مختلف حلقوں میں متکلمِ اسلام حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب کی خبرِ وفات گردش کرنے لگی، خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا، استرجاع کیا، دعاے مغفرت کی اور ساری راہ انہی کی شخصیت ذہن میں گھومتی رہی، سفر میں لکھنا پڑھنا میرے لیے مشکل ہے، میں لیپ ٹاپ کا آدمی نہیں ہوں، مجھے ان کے بارے میں معلومات بھی زیادہ نہیں تھیں، موبائل پر لکھتا بھی تو کیا لکھتا اور کیسے لکھتا، سرسری سا مضمون خود مجھے اذیت میں مبتلا کرتا ہے، سفر چار دنوں تک چلتا رہا، اس دوران متعدد مضامین نظر سے گزرے، مگر میری تشنگی قلم اٹھانے سے مانع رہی، میں نے سوچا کہ واپسی پر حضرت کے فرزند سے تعزیت بھی کرلوں گا اور ضروری معلومات بھی، چناں چہ یہی ہوا، آج بتاریخ 21 نومبر ان کے فرزندِ اکبر مولانا فاروق صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کے درِ دولت پر حاضری ہوئی، مکان وہی حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ صاحب والا۔ اینٹ کا فرش، بوسیدہ عمارت، سادگی کا مجسمہ۔ دروازہ کھٹکھٹایا، آواز دی، وہ تشریف لائے اور اس کمرے میں بیٹھے جو میری طالب علمی کے دور میں دارالعلوم وقف کا دفترِ تعلیمات رہ چکا تھا۔ بیٹھے، تعزیت کی، باتیں ہوئیں، اگلی سطور میں جو کچھ عرض کروں گا، بیش تر کا ماخذ وہی صاحب زادے ہوں گے۔

مولانا کی پہلی زیارت

مولانا سے میری ملاقات اور زیارتوں کی داستان تو بڑی طویل ہے، مگر زیارت کی پہلی سعادت اس

وقت حاصل ہوئی جب میں دیو بند بصیغہ متعلم آیا۔ میرا داخلہ گرچہ دونوں دار العلوموں میں ہوا تھا، تاہم تعلیم کے بقیہ مراحل قدیم دار العلوم میں گزارے۔ دار العلوم وقف اس وقت تعلیم کے معاملے میں دار العلوم کے ٹکر کا تھا، یہی معنویت کبھی کبھار وقف دار العلوم کھینچ لاتی۔ یہاں آتا تو دورۂ حدیث میں جس استاذ کا گھنٹہ پڑتا، ان سے استفادے کے لیے بیٹھ جاتا۔ حضرت مولانا کی پہلی زیارت یہیں ہوئی۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، خمیدہ نگاہیں، دراز قامت، سرو قد، مناسب جسم، عصا بدست، کرتا پاجامے میں ملبوس، آنکھوں پر عینک۔ یہ ان کا سراپا تھا۔ آئے، عبارت پڑھی گئی، تقریر ہوئی، مختصر تشریح، ضروری توضیح۔ زائد گفتگو سے اجتنابِ کلی۔ گھنٹہ ختم ہوا اور وہ خراماں خراماں درس گاہ سے نکل کر یہ جا، وہ جا۔

پھر زیارتوں کا سلسلہ رہا، درس گاہ سے لے کر جلسہ گاہ تک ہر جگہ ان کا تعاقب۔ ان کی تقریر کا بڑا شہرہ تھا۔ دیو بند کے بعض جلسوں میں ان کی خطابت کے جوہر دیکھنے کو ملے۔ دل نشیں طرزِ اظہار، خوب صورت اسلوبِ بیان، خاندانی روایات کا اعادہ، الفاظ کا مناسب استعمال۔ دیکھا کہ سامعین گوش بر آواز ہیں۔ میں ان کی تقریر پر ٹکٹکی لگائے رکھتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ شعر پہلی بار انہیں سے سنا تھا:

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے، نقشِ روئے محمد بنایا گیا

پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی، بزمِ کون و مکاں کو سجایا گیا

دار العلوم سے نکلا تو پھر ان کے جلووں سے محرومی رہ گئی۔ پھر دیکھا، نہ سنا، تاہم احوال آتے رہے۔ سن 2008 میں بصیغۂ مدرس دیو بند آیا تو ان کی زیارتوں کا موقوف سلسلہ پھر شروع ہوا اور وفات سے چند ماہ پیش تر تک جاری رہا۔ زیارتوں کے ساتھ ملاقاتیں بھی رہیں اور استفادے کی راہیں بھی پے در پے کھلتی رہیں۔

سوانحی خدوخال

مرحوم کی ولادت 1937 میں ہوئی، والدِ ماجد سے تو ایک عالم واقف ہے، دار العلوم دیو بند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ۔ دادا بھی کسی عہد میں مشہورِ زمانہ رہے، یعنی شمس العلما حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ۔ رہے پردادا، تو دار العلوم کے اول آخر سب، یعنی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ مولانا کی ننھیال رام پور منیہاران سہارن پور ہے، نانا کا نام حکیم محمود، جو اپنے وقت کے بے حد نباض طبیب تھے، دستِ شفا سے سرفراز، سب کے لیے مرجعِ خلائق۔

تعلیمی مراحل

جب پورا گھر ہی علم وعرفان کا سرچشمہ تھا، تو اس سے گھر کا فرد کیوں چوک جاتا، چناں چہ کم عمری میں ہی تعلیم شروع کردی گئی۔ ابجد سے لے کر بخاری شریف تک پوری تعلیم دارالعلوم میں ہوئی۔ پڑھتے گئے، چڑھتے گئے۔ فراغت 1958 میں ہوئی۔ بخاری شریف ابتداء شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے پڑھی، جب ان کا وصال ہوا تو حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی سے بقیہ حصے پڑھے۔ دورۂ حدیث کے سارے اساتذہ نامور ہیں: علامہ ابراہیم بلیاویؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز امروہویؒ وغیرھم۔

فراغت کے بعد

فراغت کے بعد دوسال تک فارغ بیٹھے رہے، اس دوران حکیم الاسلام قاری طیبؒ نے ری یونین اور افریقہ کے دورے کیے تو رفاقت کی ذمے داریاں انہوں نے ہی انجام دیں۔ خالی اوقات میں مطالعات کو اپنا مشغلہ بنایا۔ حضرت قاری صاحبؒ کے اسفار میں زیادہ ترحقِ رفاقت یہی ادا کرتے۔

دارالعلوم سے وابستگی

دوسالہ مطالعاتی دور کے بعد 1960 میں بحیثیت ناظمِ برقیات دارالعلوم میں تقرر ہوا، بڑے فرض شناس نکلے۔ حسنِ انتظام کے خوگر اور سلیقہ مندی کے پاسبان۔ ان کا دورِ نظامت حسنِ انتظام کے لیے یاد رکھا جاتا ہے۔

مضمون نگاری کا آغاز

سبھی جانتے ہیں کہ برقیات کا شعبہ خالص غیر علمی ہے، مگر طبیعت میں علم پرستی ہو تو آدمی اپنی تشنگی کے سامان کہیں سے بھی نکال سکتا ہے۔ درس وتدریس سے نہ جڑے تو کیا ہوا، بقول کسے:

مجھے سجدہ کرنے سے کام ہے
جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

قلم سنبھال لیا اور تحریروں کی بسم اللہ کردی۔ مضمون نگاری میں انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، ان کی تحریر کا آغاز "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" کے ترجمے سے ہوا۔ یہ ترجمہ سیرتِ حلبیہ کے نام سے چودہ برسوں میں مکمل ہوا اور ۴۵ قسطوں میں چھپا۔ اب اس کی جلدیں سمیٹ کر چھ تک کردی گئی ہیں۔ اس کارنامے سے علمی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ سبھوں نے اسے پسندیدگی کی نظروں سے

دیکھا۔ پھر تو ان کے قدم بڑھتے گئے۔ اس کے بعد کچھ اور کتابیں ان کے خامۂ عنبر شامہ سے نکلیں، جن میں ضخیم کتاب ''سیرت پاک'' نمایاں ہے، تفسیرِ رازی کے ترجمے بھی ان کے قلم سے نکلے جو دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ حکیم الاسلام حضرت قاری صاحبؒ کا مجموعہ کلام ''عرفانِ عارف'' انہیں کی ترتیب سے منظرِ عام پر آیا۔

کتب خانہ قاسمی کا آغاز

ادھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور ادھر ''کتب خانہ قاسمی'' کے نام سے ایک مکتبے کی بنیاد رکھ دی، ان کی ساری کتابیں اور حضرت قاری صاحبؒ کی تصنیفات یہیں سے شائع ہونے لگیں۔ سیرت کے موضوع پر حکیم الاسلام حضرت قاری صاحبؒ کے چند رسائل کو انہوں نے مرتب فرما کر یہیں سے شائع کیا، جسے ''مقاماتِ سیرت'' کا نام دیا گیا۔

ریڈیائی تقریریں

ان کے قلم کی دھوم مچی تو آل انڈیا ریڈیو نے بھی اپنی تقریروں کے لیے انہیں یاد کیا، خوش آواز تو تھے ہی، پھر تحریر کا جادو بھی چلا چکے تھے، ان کے مشاغل میں ایک اور نیا مشغلہ شروع ہو گیا۔ ریڈیو پر ان کی تقریریں ہونے لگیں اور چار پانچ برسوں تک متواتر ہوتی رہیں۔ مولانا یہ تقریریں اپنے قلم سے تیار کرتے اور ریڈیو کے ذریعے امت سے مخاطب ہوتے۔ ان کے یہ خطبات بعد میں ''قاسمی تقریریں'' کے نام سے شائع ہوئے۔

اجلاسِ صد سالہ میں ان کی کارکردگی

اجلاسِ صد سالہ دار العلوم دیوبند کا وہ عظیم علمی و روحانی اجتماع ہے، جس کی نظیر حجاجِ کرام کے علاوہ کسی نے نہیں دیکھی۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اس زبردست ہجوم کو ''عرفاتی بھیڑ'' سے تعبیر کیا تھا۔ اسی اجلاس میں قدیم و جدید فضلاے دار العلوم کی دستار بندی عمل میں آئی تھی۔ اس میں عالمِ اسلام کی چوٹی کی شخصیات شہ نشیں اور سامعین کی صفوں میں جلوہ فرما تھیں۔ میرے دادا حضرت مولانا محمود احمد ناصریؒ اور عمِ مکرم مولانا عقیل احمد ناصری زید مجدہم کی دستار بندی بھی اسی اجتماعِ عظیم میں ہوئی تھی۔ مصر کے مشہور مجود قاری عبد الباسطؒ بھی اس میں تشریف لائے تھے۔ یہ اجتماع اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع تھا۔ چشمِ فلک نے کائنات میں ایسا نظارہ پیش تر بھی نہ دیکھا تھا اور اب تصور بھی نہیں۔ جانتے ہیں کہ اس کا روحِ رواں کون

تھا جی ہاں! یہی مولانا محمد اسلم قاسمی، جن کا ذکرِ خیر چل رہا ہے۔ یہ اجلاس تین روزہ تھا۔ 21، 22، 23 مارچ 1980 میں علم وعرفان کا یہ عظیم اجتماع منعقد ہوا تھا۔ کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ بوریہ نشین علما ایسی بھیڑ اکٹھی کرلیں گے، مگر تاریخ نے یہ سارا ریکارڈ درج کرلیا ہے۔ اجلاس کی نظامت وقت کے مقبول ادیب و مصنف مولانا حامد الانصاری غازیؒ صاحب کے سپرد کی گئی تھی۔ یہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے داماد تھے۔ ان کی رہائش بیشتر ممبئی میں ہوا کرتی۔ عمر بھی اچھی ہوچکی تھی۔ ضعف ونقاہت اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ ان کے لیے دیوبند میں طویل قیام مشکل تھا، تاہم اپنی پیرانہ سالی کے باوجود کام کی بسم اللہ تو کر ہی دی تھی۔ اجلاس کی تاریخیں ابھی مقرر نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے فضلائے کرام کے نام اور تفصیلات قلم بند کرلیے تھے۔ تیاریوں کی تمہید بطریقِ احسن جاری تھی، مگر دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ نے دیکھا کہ کام اہم اور نقاہت غالب ہے۔ اگلے مراحل مزید دشوار گزار ہیں۔ شوریٰ نے نظامتِ اجلاس کے لیے مولانا مرحوم کے نام کی تجویز پیش کردی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور جو شخصیت نرم دمِ گفتگو نظر آرہی تھی، وہ گرم دمِ جستجو کا نمونہ بن کر سامنے آئی۔ ان کی تقرری اجلاس سے دس ماہ پیش تر ہوئی۔ ان کی نظامت کیا آئی مہم نے رفتار پکڑی۔ مرحوم نے اپنے ساتھ مظاہرِ حق جدید کے مصنف مولانا عبداللہ جاوید زید مجدہم کو ساتھ لگایا۔ ان کے علاوہ دوسرے گرم خونوں کو عملہ میں شامل کیا۔ اس طرح مولانا کی نظامت میں اجلاس کی تیاریاں پروان چڑھتی رہیں۔ شہر تو دولہن کی طرح پہلے ہی سجا تھا۔ بیابان بھی خیابان میں تبدیل ہوگیا۔ خیمے ہی خیمے۔ انتظامات ہی انتظامات۔ اجلاس کی تاریخوں کا اعلان ہنوز نہیں ہوا تھا، عوام اس تعیین کا بے صبری سے انتظار کررہے تھے۔ اصرار حد سے بڑھا تو مرحوم کی نظامت کے دوسرے تیسرے ہفتے ہی تاریخوں کی تعیین عمل میں آئی۔ اجلاس کی کامیابی کا پورا سہرا یقیناً حضرت مرحوم اوران کے عملہ کے سر سجتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کوہ کنی اور خارا شگافی میں جوئے خوں کتنی بار سر سے گزری۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

مسندِ درس پر جلوہ ریزی

ادھر اجلاسِ صد سالہ ختم ہوا اور ادھر دارالعلوم ایک دیوہیکل حادثے کے آہنی چنگل میں پھنس گیا۔ داستان بڑی دل خراش ہے۔ اس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اساتذہ دارالعلوم دو خیموں میں بٹ گئے۔ نتیجتاً حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کے اہتمام دارالعلوم پر فل اسٹاپ لگ گیا۔ اس طرح ان کے کم وبیش ساٹھ سالہ دورِ اہتمام کا ناخوشگوار اختتام ہوا۔ شر کے اس پہلو سے عظیم خیر کا ظہور ہوا۔

دارالعلوم وقف کے نام سے ایک دوسرے عالمی ادارے نے آنکھیں کھولیں۔اس کے قیام اورعروج و شباب میں فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کا کردار بے حد نمایاں ہے۔مرحوم مولانا اسلم صاحب ہنگامے کے بعد خالی بیٹھے تھے۔حضرت شاہ صاحبؒ سیرتِ حلبیہ کے ترجمے کے دوران ان کی قابلیت دیکھ چکے تھے، انہیں بطور استاذ اس ادارے میں لے آئے۔اب وہ دارالعلوم کے ناظمِ برقیات نہیں، دارالعلوم وقف کے مؤقر استاذ ہو گئے۔تدریس چلی اور خوب چلی۔لگا ہی نہیں کہ ۴۵ر سال کا ایک نیا مدرس اسباق پڑھا رہا ہے، بلکہ اپنی وسعتِ مطالعہ، قوتِ تفہیم اور زورِ بیان سے ایک کامل مدرس کے روپ میں ڈھل گئے۔طلبہ بھی مستفید۔انتظامیہ بھی مطمئن۔یہ ۱۹۸۲ء تھا۔اس کے بعد سے تدریس نے انہیں ایسا پکڑا کہ ایک عظیم وعبقری استاذ کی شکل میں دنیا کے سامنے جلوہ گر ہوے۔وہ عام مدرس سے لے کر شیخ الحدیث تک بنے۔جس جماعت کی جونسی کتابیں انہیں ملیں، انہوں نے اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کیا۔اپنے ۳۴ر سالہ دورِ تدریس میں انہیں ہدایہ اولین، مشکوۃ، ترمذی شریف اور اخیر میں بخاری شریف پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

دارالعلوم وقف میں دیگر ذمے داریاں

مولانا نے صرف مسندِ تدریس کو ہی زینت نہیں بخشی، بلکہ انتظامی امور بھی بحسن وخوبی انجام دیے۔ فخر المحدثین حضرت شاہ صاحبؒ ۲۰۰۸ میں رہ گزاے آخرت ہوے تو صدر المدرسین اور ناظمِ تعلیمات انہیں ہی نامزد کیا گیا۔یہ مولانا کا کمال ہے کہ اپنی ضعیف العمری کے باوجود ان مناصب کا حق ادا کرنے کے لیے نہایت چاق وچوبند رہے۔

آسمانِ خطابت کے نیّرِ اعظم

مولانا نے تدریس سے وابستگی کی تو اس سے وابستہ کئی صلاحیتیں اجاگر ہونا شروع ہوگئیں۔ان کی خطابت کی عمر بھی وہی ہے جو عمر ان کی تدریس کی ہے۔تقریر پر آے تو سامعین کو حیران کر دیا۔علوم وافکار کا بہتا دریا، بہترین لب ولہجہ، فصاحت سے بھرپور زبان، بلاغت سے معمور بیان۔وہ حافظِ قرآن نہیں تھے، مگر موقع بہ موقع قرآن سے استدلال ان کا مثالی تھا۔پھر تو وہ اہم اجلاس کی زینت بن گئے۔میں نے اپنی طالب علمی کے دور میں ان کی کئی تقریریں سنیں۔آخری بار سننے کا اتفاق محمود ہال دیوبند میں ہوا۔یہ ابھی دو

سال پہلے کی ہی بات ہے۔ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم کو حیدر آباد کی ایک علمی تنظیم نے ''حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی ایوارڈ'' دیا تھا۔ اسی سلسلے میں ایوارڈ دہندہ تنظیم کے اظہارِ تشکر اور صاحبِ اعزاز حضرت خطیب الاسلام کے استقبال کے لیے دیوبند کا یہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس میں دیوبند کی مؤقر شخصیات نے شرکت کی تھی۔ حفید الانور حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری اور نبیرہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی دام ظلہما بھی شریکِ اجلاس تھے۔ اس جلسے میں مجھے بطور مقرر مدعو کیا گیا تھا، اجلاس کے کرتا دھرتا معروف عالمِ دین محترم مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی زید مجدہم تھے۔ حضرت خطیب الاسلام تو بڑھتی نقاہت کے سبب تشریف نہ لا سکے، مگر متکلمِ اسلام حضرت مولانا محمد اسلم صاحبؒ کی تشریف آوری ہوئی۔ دیکھا تو بخار سے پورا جسم لرز رہا تھا۔ چلنا بھی دشوار۔ بولنا مشکل۔ تاہم کپکپاتے ہونٹوں اور لڑکھڑاتی زبان سے تقریر ہوئی۔ وہی شستہ زبان۔ وہی گھلاوٹ۔ وہی جاذبیت۔ سلسلہ کلام زیادہ دیر نہیں چلا، مگر جتنا چلا، شاندار تھا۔

شعر و سخن کے شہ سوار

مولانا صرف بہترین منتظم، بابصیرت مدرس، باکمال خطیب اور قابلِ رشک مصنف ہی نہیں تھے، وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کا تخلص رمزی تھا۔ جس طرح رمز سے ہر کوئی آشنا نہیں ہوتا، اسی طرح ان کی شاعری بھی عالم آشکار نہیں تھی۔ مجھے اجمالاً اتنی تو خبر تھی کہ انہوں نے کبھی شاعری کی ہے، مگر ان کی پایۂ ذوقِ سخن کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کا کوئی کلام بھی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ مخدومِ گرامی رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دامت برکاتہم نے جب اس طرف توجہ دلائی تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب ایسا ہے تو کیوں نہ ان کے فرزند سے کچھ نمونے لے لیے جائیں۔ چناں چہ صاحب زادہ محترم مولانا فاروق صاحب زید مجدہم سے رابطہ کیا اور ڈائری منگائی تو مرحوم کا اور ہی رنگ سامنے آیا۔ خوب صورت اشعار سے پوری ڈائری بھری ہوئی۔ ۱۰۰ر کے قریب نعتوں، نظموں، تہنیت ناموں اور غزلوں کا حسین گل دستہ میرے سامنے تھا۔ خوش خطی کے ساتھ۔ اس بیاض سے مولانا کے دو راز سے پردے ہٹے۔ ایک تو یہ کہ وہ خوش نویس بھی تھے۔ پوری بیاض سلیقے اور صفائی سے لکھی ہوئی۔ آرائش و تزئین بھی مکمل ملحوظ۔ دوسرے ان کا ذوقِ سخن اور حیرت انگیز قدرتِ کلام۔ تقریباً ہر کلام پر عنوان چڑھا ہوا۔ ایک ایک کلام بیس بیس پچیس اشعار پر مشتمل۔ بعض کلام تو پچاس پچاس اشعار کو محیط۔ مثنیٰ، مربع ہر نوع کی تخلیقات۔ اللہ جانے

کہ ان کا کلام اب تک کیوں شائع نہیں ہوا۔ حالاں کہ وہ اردو زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اگر وہ چھپے تو ڈیڑھ دو سو صفحات سے کم میں نہیں آئے گا۔ میں نے چاہا کہ اچھے اشعار کا زیادہ سے زیادہ انتخاب ہو، مگر قلتِ وقت دامن گیر تھی اور صاحب زادہ محترم کی مصروفیت عناں گیر۔ تاہم جو بھی حاصل ہو سکا، آپ کی خدمت میں پیش ہے، ''اجڑی بہاریں'' کے عنوان سے ایک طویل نظم کا مطلع یوں عرض کیا ہے:

چمن کی اجڑی بہاروں کو یاد کرتے ہیں
تری نگہ کے شراروں کو یاد کرتے ہیں

اور آگے لکھتے ہیں:

خوشا کہ وہ جو مجسّم بہار و نغمہ تھے
ہم ایسے سینہ فگاروں کو یاد کرتے ہیں
ملا ہے عشق سے یہ درسِ ناگوار کہ ہم
گلوں کو بھول کے خاروں کو یاد کرتے ہیں

ایک نظم کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں:

سمجھا تھا جسے ہم نے اک گنجِ گراں مایہ
بے مول ہوئی آخر اس دل کی خریداری

اخیر میں ایک اور طویل نظم کے یہ اشعار بھی دیکھتے جائیں:

قطرۂ ہر اشک بحرِ بے کراں بنتا گیا
حسن پابستہ رہا، عشق آسماں بنتا گیا
میں تو تنہا ہی اٹھا تھا بارگاہِ ناز سے
راہ میں بربادیوں کا کارواں بنتا گیا
رہ گزارِ شوق میں اہلِ جنوں کے واسطے
ان کا ہر نقشِ قدم اک آستاں بنتا گیا
ہم نے یوں دیکھیں شبِ غم کی کرشمہ سازیاں
جو بھی ٹوٹا وہ ستارہ آسماں بنتا گیا
دیکھ اعجازِ جنوں رمزؔی کے راہِ شوق میں
ہر قدم پر زخمِ دل سے گل ستاں بنتا گیا

مولانا کی شاعری کی پختگی اور فنی گرفت پر میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ علمائے دیوبند میں ایسی شاعری بس برائے نام ہی ہے۔ ان کی اس بیاض کا آغاز ''ہجومِ شوق'' کے عنوان سے ہوتا ہے، جس میں انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عقیدت ومحبت کا حسین نذرانہ پیش کیا ہے۔ بیاض کی پہلی تخلیق پر 23،1،1960 درج ہے۔ پوری ڈائری میں ہر کلام کے ساتھ تاریخ لگی ہوئی ہے۔ مطالعے سے اندازہ ہوا کہ پرورشِ شعروسخن کا یہ سلسلہ تین چار دہائیاں چلا ہے۔

بیعت وخلافت

مولانا نے اپنی سادگی کی بنا پر کبھی یہ نہیں بتایا کہ سلوک وتصوف سے بھی ان کی دعا سلام رہی ہے، مگر کل ہی پتہ چلا کہ وہ اس راہ کے بھی مردِ راہ داں تھے۔ بیعت بھی اور خلافت بھی۔ پہلی بیعت تو اپنے والدِ گرامی حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ سے تھی، خلافت بھی پائی۔ 1983 میں جب والدِ گرامی دنیا سے گزرے تو مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادیؒ سے وابستگی اختیار کی۔ اس سے اصلاحِ نفس کے تئیں مولانا کی فکرمندی واضح ہے۔ یہ دونوں اکابر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفا رہے ہیں۔

اولاد واحفاد

مولانا مرحوم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے محترم مولانا فاروق صاحب قاسمی ہیں۔ یہ تقریباً دو دہائیوں سے دارالعلوم وقف کے استاذ ہیں۔ پاک سیرت اور فکرِ دنیا سے آزاد۔ گم سم۔ کم گو۔ سر جھکا کے چلتے اور سر جھکا کے ملتے ہیں۔ بےنفسی اور سادگی کا حیرت انگیز نمونہ۔ ان کی کوئی اولاد نہیں۔ دوسرے حافظ ہشام صاحب ہیں۔ ان کے پاس ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔

علالت اور وفات

مولانا کی کل عمر 80 ہوئی۔ بڑھاپا تو تھا ہی، کمزوری حاوی ہوتی گئی۔ سالِ گزشتہ شوال 1438 میں بیمار پڑے۔ سانس میں دقت اور جسمانی نقاہت بڑھتی گئی۔ دہلی کے اڈیبا ہسپتال میں ایک ہفتہ علاج معالجہ ہوا۔ کچھ افاقہ ہوا، پھر دیوبند آ گئے۔ تکلیف میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ چلنا پھرنا اسی وقت سے موقوف ہو گیا تھا۔ تاہم قدرے ٹھیک ٹھاک رہے، مگر ادھر چند ماہ سے ان کی حالت بگڑتی گئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ اس طرح ایک علمی وعبقری شخصیت نے موت کے سامنے خودسپردگی کر دی۔ نمازِ جنازہ دارالعلوم وقف کے مہتمم حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی دام مجدہ نے پڑھائی۔ علم وعمل کا یہ سنگم اب گورستانِ قاسمی میں ابدی نیند سوتا ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ ...

مولانا محمد رضی قاسمی اکبرآبادی
مدرس ادارہ جامع العلوم دہرادون

۸ / جولائی بروز شنبہ ۲۰۱۷ء اور ۱۴ / شوال ۱۴۳۸ھ کی درمیانی شب تقریباً سوا دس بجے سوشل میڈیا پر ایک دل دہلانے والی خبر گردش کرنے لگی کہ حضرت مولانا نسیم احمد صاحب غازی مظاہری شیخ الحدیث دارالعلوم جامع الہدیٰ مرادآباد اس دارِفانی سے ابھی کوچ کر گئے، خرمنِ ہستی پر ایک صاعقہ آسمانی تھی اور ایسی غیر متوقع کہ وہم وگمان میں بھی اس کا تصور نہ تھا، ہر شخص کی یہ تمنا تھی کہ کاش یہ خبر وحشت اثر غلط ثابت ہو، کیوں کہ بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی موت ایک نفس اور ایک ذات سے بڑھ کر ایک عالَم کے لئے موت بن جاتی ہے، اس کی موت سے علم وفن کے چراغ بجھ جاتے ہیں، فکر وآگہی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ ایمان ویقین کی محفلیں ویران ہو جاتی ہیں، میرے نانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ایسی ہی تھی۔ ان کی شخصیت سے علم وفن کی ایک تاریخ وابستہ تھی، ان کے ایمان وایقان کی حرارت سے بہتوں کو ایمان کی روشنی نصیب ہوئی، ان کے سانحۂ ارتحال سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس دورِ قحط الرجال میں بہ ظاہر اس کا پر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے ؎

اے عشق مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

ہمہ جہت شخصیت:

نانا مرحوم جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے، وہ دیدہ ور عالم بھی تھے، صاحبِ نظر محدث ومفسر بھی، تقریر وخطابت میں یدِ طولیٰ بھی رکھتے تھے اور میدانِ تحقیق وتصنیف میں مہارت بھی، وہ باکمال مدرس بھی تھے اور ایک دردمند داعی ومصلح بھی، وہ زبان وبیان کا ستھرا ذوق بھی رکھتے تھے اور شعر وسخن سے وابستگی بھی، تزکیہ واصلاح کی راہ کے رہبر ومقتدیٰ بھی تھے اور سخاوت وشجاعت کے جوہر سے مالا مال بھی۔ غرضیکہ نانا مرحوم کی ذات مختلف ستودہ صفات کی حامل تھی ؎

جس کی ستودہ ذات پر نسلیں کریں گی ناز
افسوس ایسا عالمِ فرزند کھو گیا

ولادت ووطن:

ضلع بجنور کے مشہور ومعروف مردم خیز قریہ ''تھے پور'' کو روزِ اول ہی سے علوم دینیہ، ومعرفت الٰہیہ کی نسبتیں اور دین ودنیا کی نعمتیں حاصل رہی ہیں، یہ بستی ہمیشہ رجال اللہ، اصحابِ فضل وکمال علماء وصلحاء اور باکمال شخصیات کا مسکن ووطن رہی ہے، میرے نانا مرحوم کی ولادت اسی بستی کے صدیق النسب خانوادے میں ماہِ شعبان ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء کو ہوئی اور یہی گاؤں آپ کا آبائی وطن ہے۔

تعلیم وتربیت:

نانا مرحوم کی تعلیم کا آغاز اپنی اسی نورانی وعرفانی بستی سے ہوا، قرآن پاک ناظرہ، دینیات دوسرے درجہ تک اردو اور ہندی یہیں پڑھی، پھر فارسی اور عربی کی تعلیم ''کافیہ'' تک شیخ المشائخ عارف باللہ حضرت مولانا الشاہ عبدالرحیم صاحب تھے پوریؒ سے مدرسہ حسینیہ قاسم العلوم دھامپور میں حاصل کی اور اس کے بعد آپ ۱۳۷۲ھ میں ہندوستان کی مشہور ومعروف درسگاہ مظاہر علوم سہارن پور آ گئے، مظاہر علوم کا یہ وہ زمانہ ہے جب یہاں علم وعمل کی جامع اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے ایسی برگزیدہ اور چنیدہ ہستیاں تھیں کہ اس وقت ان کی نظیر نہ صرف صغیر بلکہ پوری دنیا میں ملنی مشکل ہے، وہ بلاشبہ صحابہ صفات تھے، ان کے اخلاص وللّٰہیت کی قسم کھائی جاسکتی ہے، نانا مرحوم نے ان شخصیات سے کسبِ فیض کیا اور لمحہ لمحہ سے فائدہ اٹھا کر یہاں کی علم ریز، روحانیت خیز، اخلاص بیز اور زہد واتقاء سے لبریز فضائے مسعود سے اپنے علم وفکر کی جھولی بھرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، یہاں آپ کے خاص اساتذہ میں برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ مہاجر مدنی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا الشاہ اسعد اللہ صاحبؒ خلیفہ ومجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وسابق ناظمِ اعلیٰ مظاہر علوم سہارن پور تھے، دونوں ہی بزرگوں سے آپ بیعت اور ثانی الذکر کے آپ خادم خاص تھے، پانچ سال آپ اس میخانۂ علم وعرفاں سے فیض یاب ومستفید ہو کر ۱۳۷۷ھ میں دورۂ حدیث شریف کی پوری جماعت بلکہ پورے مظاہر علوم میں سب سے اول اور اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے جس پر آپ کو مدرسہ کی جانب سے خصوصی انعام سے سرفراز کیا گیا (جیسا کہ روداد مظاہر علوم بابت ۱۳۷۷ھ میں موجود علمائے مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات ۲/۳۷۲، میں موجود ہے۔

سلسلۂ تدریس:

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد سے تادمِ مرگ تعلیم وتدریس، تقریر وتبلیغ، تصنیف وتالیف، بیعت وارشاد، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل آپ کا مشغلہ رہا۔ اس عرصہ میں نانا مرحوم نے ملک کی معیاری

درسگاہوں میں کامیاب اور مقبول مدرس کی حیثیت سے درس نظامی کی تقریباً تمام کتابوں کا درس دیا بلکہ نانا مرحوم کی تدریس، اخلاص اور جہد مسلسل کی بناء پر جن مدارس میں آپ نے خدمات انجام دیں ان کے تعلیمی معیار میں درستگی وعمدگی، ان مدارس کو شہرت ومقبولیت اور استحکام نصیب ہوا، جس جگہ بھی آپ تدریس کے لئے گئے یا وہاں سے اپنا تدریسی سلسلہ منقطع کیا اپنے اساتذہ، خاص طور پر اپنے استاذ خاص ومرشدِ باکمال برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مشورے وحکم سے کیا، سب سے پہلے نانا مرحوم نے اشرف العلوم گنگوہ میں چھ سال، کاشف العلوم چھٹمل پور میں تقریباً ۲/ سال، جامعہ قاسمیہ شاہی میں ۴/ سال اور پھر جامع الہدیٰ مراد آباد میں ۷۷ء تا دمِ واپسیں تقریباً ۴۰/ سال جس میں ۲۸/ برس بخاری شریف دونوں جلدیں مکمل اور دیگر کتب احادیث کا درس پوری شان وشوکت، اخلاص وللّٰہیت، قناعت واستغناء کے ساتھ دیا اور اس دوران ہزاروں طلبہ نے آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی تشنہ کامی کا سامان بہم پہونچایا جو ملک وبیرون ملک میں مختلف شعبہائے دین میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تقریر وخطابت:

خدائے وہاب نے نانا مرحوم کو تقریر وخطابت زبان وبیان کی نعمتِ بے بہا سے بھی مالامال فرمایا تھا، زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو آپ کے استاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سہارن پور او رسہارن پور کے قرب وجوار میں تقریر کے لئے بھیجتے، خطابت کا یہ سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے وفات تک تسلسل کے ساتھ برقرار رہا، وفات سے ایک دن قبل جمعہ سے پہلے مرکز والی مسجد مراد آباد (جس میں آپ نے تقریباً ۴۶/ سال سے امامت وخطابت تقریر وتفسیر فرمارہے تھے) میں تقریر کی اور ۳/ دن قبل آپ راقم کی بستی قصبہ اکبرآباد میں ڈیڑھ گھنٹے سے زائد بیان کیا، الغرض آپ ایک شعلہ نوا اور کامیاب مقرر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، آپ کی تقریر دینی حلقوں اور عوامی جلسوں ہر ایک کے لئے پرکشش، مفید اور نفع بخش ہوئی، آپ کی تقریر مختصر ہو یا طویل: دورانِ تقریر کبھی بھی موضوع روایات، بے سروپا حکایات، بے ڈھب اشارات، غیر معیاری کلمات زبان پر نہ آئے، بلکہ علم کی گہرائی وپختگی، الفاظ وکلمات کا صحیح تلفظ وادائیگی، معلومات کی فراوانی، زبان کی شائستگی اور سنجیدگی تقریر کا دامن نہ چھوڑتی، آپ کی تقریر سننے والے گواہی دیں گے کہ ''از دل خیزد بردل ریزد'' کا سماں ہوتا، آپ کی خطابت سے کتنے ہی گم گشتگان راہ کو صراطِ مستقیم نصیب ہوا اور کتنے ہی فتنے اپنے بال وپر نہ نکال سکے اور کتنے ہی نیست ونابود ہوگئے ؎

اب اہل چمن تجھ کو بہت یاد کریں گے
ہر شاخ پہ اپنا ہی نشاں چھوڑ گیا ہے

تصنیف وتالیف:

کامیاب مقرر وخطیب ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بلند پایہ اہلِ قلم بھی تھے اور اس میدان میں آپ کو نمایاں مقام حاصل ہے، آپ کے قلمِ فیض رقم سے چھوٹی بڑی ستر (۷۰) سے زائد کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔ایک جگہ آپ فرماتے ہیں ؎

بحمد اللہ تصنیفات ستر سے بھی زائد ہیں
مضامین دگر ہیں بیکراں، جن میں فوائد ہیں

(نغمات سرور رقم ۱۳)

آپ کی تصنیفات وتالیفات میں زبان کی لطافت، استدلال وانضباط کی قوت، مضامین کی آمد، تحقیق وتدفین کی چمک، شائستگی، شستگی اور برجستگی نمایاں ہے، آپ کے قلم میں روانی اور الفاظ ومعانی کی فراوانی ہے، آپ فرماتے ہیں ؎

قلم روکے نہیں رکتا ہے جب چلتا ہے اے غازیؔ
قدم پیچھے نہیں ہٹتا جو بڑھ جاتا ہے اے غازیؔ

چند اہم تصانیف: (۱) درسی تفسیر پارہ ۲۹/۳۰ (۲) مراۃ الانوار شرح اردو مشکاۃ الآثار (۳) اخلاص وللّٰہیت (بخاری شریف کی پہلی حدیث) (۴) بخاری شریف کی آخری حدیث (۵) حیات اسعدؒ (۶) مجموعۂ بیان رمضان (۷) مجموعۂ تحفۃ النساء (۸) محرم میں ماتم (۹) حدیث جبریل (۱۰) تحفۂ عید رمضان (۱۱) مجموعہ انوار حیات (۱۲) مجموعہ فیضان حرم (۱۳) مجموعۂ اشکوں کی بارشیں (۱۴) مجموعۂ نغمات سرور وغم (۱۵) علماء کا ادب واحترام (۱۶) عباد الرحمن (اللہ کے خاص بندوں کی پہچان) (۱۷) تبلیغی چھل حدیث (۱۹) ارشاد السالکین (۲۰) دلچسپ مکالمات حصہ اول ودوم (۲۱) خلاصۂ تورات (۲۲) خطبات غازی حصہ اول وغیرہ۔

شاعری:

ولیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد۔

گوناگوں کمالات کے ساتھ آپ کہنہ مشق عمدہ شاعر بھی تھے۔اس فن کی تحصیل کے لئے باقاعدہ کسی استاذ کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔آپ کی شاعری آپ کو موزونیٔ طبع اور فطری ذوق کی رہین منت ہے آپ فرماتے ہیں ؎

میری منظومات ذوقی کائنات
من ندانم فاعلات فاعلات
ذوق پر واز سخن کے بال و پر
ذوق ہی اس راہ میں ہے راہبر

(انوارحیات ۱۴۷)

البتہ آپ کے اس فطری ذوق کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا الشاہ محمد اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ سابق ناظم اعلیٰ جامعہ مظاہر علوم سہارن پوری کی بابرکت و بافیض صحبت نے دوآتشہ کر دیا تھا ؎

نہ میں شاعر، نہ فن شعری میں مجھ کو مہارت ہے
ملا ہے درگہِ حق سے مجھے ذوق سخن سازی
ملا پروانۂ شمع رسالت کی نگاہوں سے
مرے ذوق سخن میں ہے نہاں اک شانِ اعجازی

(فیضانِ حرم ۱۵)

''پروانۂ شمع رسالت'' سے حضرت مولانا الشاہ محمد اسعد اللہ صاحب کی ذاتِ گرامی مراد ہے۔ الغرض آپ قادرالکلام، عمدہ شاعر کی حیثیت سے بھی علمی وادبی حلقوں میں معروف ومشہور ہیں۔ آپ کی شاعری میں مقصدیت ہے، محض قافیہ پیمائی یا تصورات وخیالات کی دنیا آباد کرنا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ساغر ومینا کے تذکروں، حسن وعشق کی کشمکشوں، شاعرانہ لن ترانیوں کے بجائے حمد وثناء کے گلدستے، افراط وتفریط سے پاک نعتیں، سیرت وتاریخ کی جھلکیاں، قرآن وحدیث کے مضامین، اصلاح نفس واصلاحِ معاشرہ کے جذبات، حقائق وتجربات، امثال وحکم، نصیحتیں اور ہدایات، سرور وغم کے نغمات، دعوت فکر وعمل کا پہلو غالب ہے، آپ کے کلام میں روانی ہے، سادگی ہے، سلاست ولطافت ہے، بے ساختگی اور برجستگی ہے، آپ کے پانچ شعری مجموعے: انوارحیات، اسرارحیات، فیضانِ حرم، اشکوں کی بارشیں، اور نغمات سرور وغم زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

نوٹ: ہر ایک منظوم مجموعہ سات رسائل پر مشتمل ہے اور ''نغمات سرور غم'' آٹھ منظوم رسائل پر مشتمل ہے۔ اس طرح کل منظوم رسائل کی تعداد ۳۶/ ہے۔

آپ کی امتیازی صفت، منکر پر نکیر:

نانا مرحوم کی یہ وہ صفت ہے، جس کی وجہ سے اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

معروف اور بھلائیوں کی دعوت دینا آسان ہوتا ہے، لیکن منکر سے روکنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے، لیکن کسی کی برائی یا ملامت، کسی کی عظمت و وجاہت یا مال وزر کی چمک، کسی عہدے و اقتدار کا لالچ، کسی عزیز وقریب کی خوشنودی یا خفگی یا وقت و حالات کی نزاکت، یا کسی جماعت کی بھیڑ اور کثرت یا ہواؤں کی مخالفت کا خوف و دہشت یا بے جا حکمت و مصلحت کبھی بھی آپ کو منکر پر نکیر کے فریضے سے نہ روک سکی۔ جس بات کو وہ شرعاً غلط سمجھتے اس کو خلوت میں بھی غلط کہتے، منبر و محراب پر بھی غلط کہتے اور مجمع عام میں بھی اس کو غلط کہتے، وہ رات کو رات اور دن کو دن ہی کہتے، رات کی چمک دمک پر ان کو دن کا اور دن کی روشنی پر چھائی ہوئی ظلمت سے اس کے رات ہونے کا ان کو شبہ نہ ہوتا۔ وہ زہر کو زہر اور دوا کو دوا سمجھتے ع میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس صفت کی وجہ سے اپنوں اور غیروں سے بڑی مخالفتوں بلکہ عداوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کا تو مسلک یہ تھا ؎

تو نہ روٹھے میرے مولیٰ تیرا روٹھنا ہے غضب
گو میں راضی ہوں کہ زمانہ مجھ کو سارا چھوڑ دے

افسوس کہ اب دور دور تک ایسا بے خوف و مخلص شخص نظر نہیں آتا ؎

هيهات لا يأتي الزمان بمثله
ان الزمان بمثله لبخيل

وفات حسرت آیات: ۸ / جولائی بروز ہفتہ ۱۳ / ۱۴ شوال کی درمیانی شب عشاء کے بعد ۱۰ / بجے بغیر کسی خاص علالت یا شدید مرض کے اس عظیم شخصیت نے جس کی ۹۷ / سالہ زندگی پیہم عمل اور مسلسل جدوجہد سے عبارت تھی اپنے پیچھے ہزاروں طلبہ وعلماء، مریدین و مسترشدین اولاد و احفاد کو غم زدہ و بے قرار چھوڑ کے اپنے اصلی ٹھکانے پر پہونچ کر قرار حاصل کرلیا ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اگلے دن مرادآباد کی وسیع وعریض عیدگاہ میں مسلمانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سیلاب نے آپ کے جنازے کی نماز ادا کی اور پھر پرنم آنکھوں کے ساتھ بادل خواستہ اس گنجینۂ علم وعرفان کو سپرد خاک کیا ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
پھر خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آغاز سفر

”جامعہ ازہر“ پر ایک طائرانہ نظر

تحریر: مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمہ

ترجمہ: نورالدین پوکرنوی راجستھان/ شریک تکمیل ادب عربی، جامعہ ہذا

جامع ازہر یہ وہ بڑی مسجد ہے جو قاہرہ میں ساڑھے نو سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے قائم ہے، اسی میں وہ بڑا دینی جامعہ واقع ہے، یہ قاہرہ میں قائم کی جانے والی اولین مسجد ہے جس کو شاہِ مصر معزلدین اللہ فاطمی کے کمانڈر جوہر کاتب صقلی نے قائم کیا تھا، اس نے ۲۴ / جمادی الاولیٰ ۳۵۹ھ قاہرہ کو آباد کیا۔ اس کی تعمیر نو رمضان ۳۶۱ھ میں مکمل ہوئی۔

اس مدرسہ کا حال بھی دیگر علمی و تعلیمی اداروں کی مانند تھا کہ ابتدائی مرحلہ میں چھوٹا سا تھا۔ لیکن کچھ ہی مدت بعد اس کا دائرہ وسیع ہو گیا، اور حکام وسلاطین کے فراخ دلانہ اخراجات کے سبب اس کی شان بڑھ گئی، یہاں تک کہ یہ دینی تعلیم کا ایک سرچشمہ بن گیا، اور اس کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔ طلبہ دور دراز علاقوں سے یہاں آنے لگے، اس سے علم دین کے ہر شعبہ میں علماء وائمہ فارغ ہو کر نکلے، بادشاہوں اور امرا نے مسلسل اس کی تعمیر میں اضافہ کیا، اور اس کے گوشوں کو وسیع کیا، طلبہ کے لیے پختہ دارالاقامے بنائے اور ان میں ان طلبہ کو ٹھہرایا گیا جن کے لیے رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، بالخصوص پردیسی طلبہ کو۔ نیز اس میں درس وتدریس اور مطالعہ کی کتابیں رکھیں۔

ازہر کا نظام:

جامعہ ازہر آسان نظام پر چلتا تھا، جو فطری تھا، جس کی بنیاد تقویٰ اور اس کا ستون دین اور اہل دین کا احترام تھا، موجودہ زمانہ کے نظاموں اور انتظامات کا وہاں کوئی مظہر نہ تھا، طالب علم بلا قید و شرط اس میں داخل ہوتا، اور جن علماء کے پاس حصول علم کے لیے جانا چاہتا چلا جاتا، اس میں جب تک رکنا چاہتا، رک سکتا تھا، پھر جب اپنے اندر اتنا کافی علم اور ایسا ملکہ محسوس کرتا کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے تو وہ تدریس کے لیے بیٹھ جاتا، جہاں کہیں بھی خالی جگہ ملتی، اور اپنے آپ کو طلبہ کے سامنے پیش کرتا۔ جب طلبہ اس کو صاحب علم پاتے تو اس کے اردگرد جمع ہو جاتے اور اس کی دست بوسی کرتے لیکن اگر طلبہ کوئی دوسری چیز پاتے تو اس سے دور ہو جاتے، یہی عالمیت کی سند تھی جو علماء کو دی جاتی تھی۔

ازہر کے لیے قانون سازی:

۱۲۸۸ھ میں جامعہ ازہر کے لیے اولین قانون بنایا گیا، جس کے بعد متعدد قوانین جاری ہوئے اور ۳/محرم ۱۳۵۵ھ میں جامعہ ازہر اور دوسرے دینی، علمی و اسلامی اداروں کی از سرِ نو تعمیر کی گئی، جو حکومت کے ایک قانون کے طور پر نافذ ہو گیا، نیز قاہرہ میں ایک عام شعبہ قائم ہوا جس کو ۱۳۵۲ھ میں جامعہ ازہر کے ساتھ ملحق کر دیا گیا، اس شخص کی ضرورت کی تکمیل کے لیے جو دینی احکام اور عربی زبان میں وسعت چاہتا ہو، جب کہ اعلیٰ تعلیم اور تخصص کے لیے دوسرے اداروں کو چھوڑ کر صرف جامعہ ازہر کو خاص کر دیا گیا۔

ازہر کا ایک شعبہ علوم دین، عربی زبان، اسلامی تاریخ اور وعظ و ارشاد میں تخصص کے لیے قائم کیا گیا۔

جامعہ ازہر کے کلیات:

(۱) شرعی کالج (۲) عربی زبان کالج (۳) اصول دین کالج

جامعہ ازہر کا شیخ تمام دینی داروں میں سب سے بڑا اور پورے ملکِ مصر میں دین و علم کے مقام کے مناسب ذاتی کیریکٹر کے حوالے سب سے بلند ہوتا اور وہی ازہر کا مشرف و نگراں ہوتا تھا۔

جامعہ ازہر کی ایک کمیٹی ہے جس کو ''ازہر سپریم کونسل'' کہا جاتا ہے جو اس کے امور اور اس کے انتظام کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کمیٹی کی سربراہی جامعہ ازہر کے شیخ کرتے ہیں۔

جامعہ ازہر اور دیگر علمی و اسلامی اداروں کا بجٹ ۱۹۳۶ھ اور ۱۹۳۷ھ میں ۹۷۶ / ۳۲۳ مصری ڈالر پہونچ گیا تھا، مدرسین و ملازمین کے لیے مختص ملازمتوں کی تعداد ۷۶۷ اور عارضی ملازمتوں کی تعداد ۲۳۱ تک پہونچ چکی تھی جب کہ تعلیمی سال ۱۹۳۷ھ میں جامعہ ازہر میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۱۱۱۳۰ تک ہو چکی تھی۔

ازہر کے اکثر طلبہ مصر، سوڈان، ترکی، اور مراکش کے ہوتے تھے، ان میں سے کچھ افغانستان، چین، عراق، ہندوستان، جاوہ، عجم، سنار صومالیہ اور جنوبِ افریقہ وغرہ سے بھی آتے ہیں۔

جامعہ ازہر میں کتابوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو اس کے مختلف ہاسٹلوں اور کمروں میں منتشر تھی، پھر جب ازہر کی اصلاح اور اس کی حالت کو سنوارنے کی طرف توجہ دی گئی، تو ۱۸۹۸ء میں ایک جنرل کتب خانہ بنایا گیا، جس کا نام رکھا گیا ''دار الکتب الازھریۃ الکبریٰ'' جس میں ان کتابوں کو جو ازہر کے کمروں میں پھیلی ہوئی تھیں ان کو ترتیب سے یکجا رکھ دیا گیا، اور اس کے لیے ضروری مالی اخراجات اور کارکن فراہم کیے گیے، یہ کتب خانہ برابر ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ ۲۶۲۷ کتابوں پر مشتمل ہو گیا، ان میں مطبوعہ کتابیں بھی تھیں اور مخطوطہ بھی اس میں بعض اہم اور کمیاب کتابیں ایسی ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں نہیں پائی جاتیں۔

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری، استاذ حدیث جامعہ ہذا

شش ماہی امتحان اور اس کے نتائج:

طلبہ کی صلاحیتوں اور کتابی وابستگی کا اصل رُخ امتحان سے ہی سامنے آتا ہے۔ جامعہ میں عربی سوم تک کی جماعتوں کا امتحان ماہانہ بھی ہوتا ہے، شش ماہی اور سالانہ بھی۔ جس سے طلبہ کی تعلیمی استعداد پختہ تر کرنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ گزشتہ دنوں جامعہ میں شش ماہی امتحان کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ امتحان 15 سے 20 نومبر 2017 تک چلا۔ امتحان کے لیے حسبِ سابق دیو بند واطراف کے ماہر اساتذہ کو مدعو کیا گیا، جنہوں نے طلبہ کی تعلیمی تیاریوں کا ہمہ پہلو جائزہ لیا۔ دارالعلوم دیو بند، وقف دارالعلوم دیو بند اور دیگر مدارس کے اہم مدرسین نے یہ فرائض انجام دیئے۔ ہر جماعت کی ایک کتاب روک لی گئی۔ بعد ازاں تعطیلِ شش ماہی کا اعلان کر دیا گیا۔

تعطیلِ امتحانِ شش ماہی:

جامعہ میں گزشتہ دو سالوں سے تین بڑی تعطیلات ہو رہی ہیں۔ تعطیلِ سالانہ، تعطیلِ ذی الحجہ اور تعطیلِ شش ماہی۔ امتحان کے بعد 21 نومبر سے 3 دسمبر تک تعطیلِ عام رہی۔ ان ایام میں طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے وطن چلے گئے۔ مطبخ بند رہا۔ جو طلبہ جامعہ میں قیام پذیر رہے، ان کے طعام کا نظم من جانب جامعہ کیا گیا۔

تعلیمی مصروفیات کا آغاز:

ایامِ تعطیل جوں ہی گزرے، تمام اساتذہ اور طلبہ 3 دسمبر کی شام تک واپس آ گئے۔ جامعہ کی تعلیمی سرگرمی ایک بار پھر جاری ہو گئی۔ لیکن اس سے قبل 4 دسمبر کو طلبہ کی بچی ہوئی ایک کتاب کا امتحان بھی ہوا۔ جو طلبہ اس آخری امتحان میں شریک نہ ہوئے، حسبِ ضابطہ ان کا اخراج کر دیا گیا۔ امتحانی مرحلے کے بعد تعلیمی مصروفیات کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ ساتھ ہی مطبخ بھی جاری کر دیا گیا۔

نتائجِ امتحان چسپاں:

شش ماہی امتحان کے نتائج آویزاں کر دیے گئے ہیں۔ نتائج الحمد للہ بہت بہتر رہے۔

ممتحنینِ کرام نے جن کتابوں میں کمزور گوشوں کی بطورِ خاص نشان دہی کی تھی، انہیں نوٹ کر کے متعلق اساتذہ کو باخبر کر دیا گیا، تاکہ انہیں دور کیا جا سکے۔

پوزیشن لانے والے طلبہ:

درجۂ حفظ:

محمد آفتاب ارریہ (اول)، عبادالرحمن کبیر نگر (دوم)، محمد اسماعیل سدھارتھ نگر (سوم)۔

درجۂ اعدادیہ:

محمد اکمل خان شاملی (اول)، تقی احمد ارریہ (دوم)، سید حمزہ مرغوب دیوبند (سوم)۔

عربی اول:

محمد اکرام ہریانہ (اول)، محمد صادق مظفر نگر (دوم)، ذی شان فاروق کشمیر (سوم)۔

عربی دوم:

محمد اظہر اڑیسہ (اول)، محمد حذیفہ سدھارتھ نگر (دوم)، عبدالقادر متھرا (سوم)۔

عربی سوم:

محمد ارمان نہال کوڈرما (اول)، محمد اسلم کشن گنج (دوم)، محمد دانش کشمیر (سوم)۔

عربی چہارم:

محمد یاسر مہاراشٹر (اول)، مستفیض اختر اتر دیناجپور (دوم)، محمد حسن سرور دربھنگہ (سوم)۔

عربی پنجم:

محمد انس آندھرا (اول)، شیخ محمد علی آندھرا (دوم)، محمد شوکت علی اڑیسہ (سوم)۔

دورہ حدیث شریف:

محمد زاھد ارشاد دہلی (اول)، محمد اخلاق الرحمن (دوم)، عبدالباسط اڑیسہ (سوم)۔

تکمیلِ ادب:

رحمت اللہ راجستھان (اول)۔

تکمیلِ افتاء:

محمد عارف حسین بنگال (اول)، محفوظ الرحمن بستی (دوم)، محمد طالب مظفر نگر (سوم)۔

مجلسِ تعلیمی کی تجدید:

تعلیمی نظام کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے آغاز ہی سے مجلسِ تعلیمی قائم ہے، جو بہت ہی بہتر انداز میں اپنا کام کر رہی ہے۔ 5 جمادی الاولیٰ کو اس مجلس کی تجدید کی گئی، جس کے ارکان حسبِ ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دام ظلہم

(۲) حضرت مولانا عبد الرشید بستوی زید مجدہم

(۳) محترم جناب مفتی وصی احمد بستوی زید مجدہم

(۴) محترم جناب مولانا فضیل احمد ناصری زید مجدہم

(۵) محترم جناب ماسٹر زعیم عابد صاحب زید مجدہم

مجلس کی نظامت حضرت رئیس الجامعہ دام ظلہ فرمائیں گے۔ تعلیمات سے متعلق سارے امور مجلس سے مشاورت کے بعد باختیارِ ناظمِ تعلیمات نافذ ہوں گے۔

وقفے کی منظوری:

صبح کے اوقات میں چوں کہ لگاتار چار گھنٹے کی تعلیم ہوتی ہے، جس سے طلبہ کے لیے قضائے حاجت کا مسئلہ درپیش رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ کہ ان کے اسباق متاثر ہوجاتے ہیں۔ ان کی اسی پریشانی کے سبب سے مجلسِ تعلیمی نے 15 منٹ کا وقفہ رکھا ہے، جس کا نفاذ عمل میں بھی آچکا ہے۔

رواقِ انظر کی تعمیر کا آغاز عن قریب:

طلبہ کی روز افزوں تعداد کے پیشِ نظر جامعہ میں رہائشی کمروں کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ دارالاقامہ میں عدیم الوسعتی کی بنا پر طلبہ کی ایک تعداد باہر رہتی ہے، جامعہ نے اس بڑی مشکل سے نجات پانے کے لیے نئی تعمیر کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تعمیر سہ منزلہ ہوگی اور 36 کمروں پر مشتمل۔ اسے رواقِ انظر کا نام دیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ اس عمارت کی تعمیر کا عن قریب ہوجائے گا۔ دارالحدیث انور ہال کے مغربی حصے میں یہ عمارت بنائی جائے گی۔ جس کا ابتدائی کام شروع ہوچکا ہے۔

احاطۂ مطبخ کی تعمیر شروع:

طلبہ کے خورد ونوش کے لیے جامعہ میں ابتدا سے ہی مطبخ کا انتظام ہے، جہاں دونوں وقت کی خوراک تیار کی جاتی ہے، مگر مطبخ کی موجودہ جگہ قدرے تنگ ہے، ضرورت تھی کہ اسے وسعت دی جائے، چناں چہ اس کی توسیع کا کام شروع کردیا گیا ہے۔ مطبخ کے لیے باقاعدہ ایک احاطہ بھی تعمیر ہوگا، تاکہ اس کے لوازمات محفوظ ومستور رہیں۔

سالانہ انعامی اجلاس کا اعلان:

جامعہ میں ہر سال طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامی اجلاس کا انعقاد ہوتا ہے، جس میں سالِ گزشتہ کے

ممتاز طلبہ کو گراں قدر انعامات بصورتِ کتب اور نقد روپے دیے جاتے ہیں۔مجلسِ تعلیمی منعقدہ ۵/ جمادی الاولیٰ کی تجویز کے مطابق اگلا سالانہ انعامی اجلاس ۴/ رجب المرجب کو منعقد ہوگا، جس کی اطلاع طلبہ کو دے دی گئی ہے۔ اس اجلاس میں حفظ وعالمیت سے فارغ طلبہ کی دستار بندی بھی کی جاتی ہے۔

تربیتی اجلاس کا انعقاد:

طلبہ جامعہ کی تعلیمی بیداری کے لیے وقتاً فوقتاً تربیتی اجلاس منعقد ہوتے رہے ہیں۔پچھلے دنوں بھی اسی طرح کی ایک نشست انعقاد پذیر ہوئی۔نشست کی نظامت محترم جناب مولانا ابوطلحہ اعظمی زید مجدہم استاذ جامعہ نے کی۔تربیتی بیان احقر فضیل احمد ناصری کا ہوا۔راقم السطور نے طلبہ سے کہا کہ وقت بڑا بے رحم واقع ہوا ہے، وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔یہ لوٹ کر واپس نہیں آتا،لہٰذا تعلیم کے ان اوقات کو غنیمت جانیے۔جو شخص وقت کو کام میں نہیں لاتا، اسے بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔احقر نے مزید کہا کہ والدین کو آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔اگر آپ محنت کر کے کامیاب طالب علم نہیں بن سکتے تو یہ والدین کے ساتھ فریب کے ساتھ خود آپ کے ساتھ دھوکہ ہے۔اگر آپ فرصت کے ان لمحات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے تو آپ ظالم ہیں اور ظالم ہمیشہ خسارے میں ہیں۔

محترم جناب مولانا مفتی نثار خالد صاحب دیناجپوری زید مجدہم کی دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

شعبۂ محادثہ کا پہلا اجلاس:

طلبہ میں خارجی مطالعات کا رجحان پیدا کرنے اور اپنے مافی الضمیر کو مضبوط انداز میں رکھنے کا فن سکھانے کے لیے جامعہ نے رواں سال سے شعبۂ محادثہ قائم کیا ہے، جس کا پہلا اجلاس 16 جمادی الاولیٰ کو محترم مولانا صغیر احمد صاحب پرتاپ گڑھی زید مجدہم استاذِ حدیث کی سرپرستی اور محترم جناب مولانا نثار خالد صاحب زید مجدہم کی حکمیت میں منعقد ہوا۔اس موقع پر علم غیب کے موضوع پر ایک وقیع محادثہ طلبہ کی طرف سے پیش کیا گیا۔دونوں فریق نے اپنے اپنے موقف کی تائید کے لیے اپنی بساط کے مطابق حوالجات ودلائل پیش کیے۔حاضرین نے طلبہ کی ان کوششوں کو خوب سراہا۔اخیر میں حکم صاحب نے موضوع کو مزید منقح اور روشن کیا۔اس موقع پر متعدد اساتذہ موجود رہے۔محترم مولانا ابوطلحہ اعظمی صاحب کی دعا پر محادثہ کا اختتام ہوا۔

دارالحدیث انور ہال کی تعمیر تقریباً مکمل:

جامعہ کی عظیم الشان عمارت ''دارالحدیث انور ہال'' کا تعمیری کام تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ کھڑکیوں، دروازوں کے رنگ وروغن سے تو بحمد اللہ چند ماہ پیشتر ہی فراغت ہوگئی تھی۔ان کے علاوہ پوری

عمارت کا رنگ وروغن بھی تقریباً مکمل ہی ہے۔ چند حصے روغن سے رہ گئے ہیں، جن سے ان شاء اللہ جلد ہی فراغت پالی جائے گی۔

یہ عمارت جامعہ کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ جامعہ کے سارے تعلیمی اور انتظامی دفاتر یہیں کام کر رہے ہیں۔ تعلیم بھی یہیں چل رہی ہے۔ دارالحدیث بھی اس عمارت میں ہے۔ اس کا انتساب عالمِ اسلام کی عبقری شخصیت اور عہد ساز محدث وفقیہ، خاتم الفقہاء والمحدثین امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی طرف ہے۔

حضرت مولانا اسلم قاسمی صاحب کے انتقال پر تعزیتی نشست:

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے فرزندِ ثانی حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب کا 13 نومبر 2017 کو انتقال ہوگیا۔ وہ کافی دنوں سے علالت سے دوچار تھے۔ انتقال کی خبر سنتے ہی جامعہ میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دامت برکاتہم اور اساتذہ کرام نے مرحوم کے اہلِ خانہ کو تعزیتِ مسنونہ پیش کی۔ جامعہ میں ان کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ بعدازاں حضرت رئیس الجامعہ مدظلہ کی صدارت میں تعزیتی نشست بھی منعقد ہوئی، جس میں حضرت مرحوم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی اور ان کے کارناموں کو یاد کیا گیا۔

مرحوم نے کل 80 برس کی عمر پائی۔ اس دوران انہوں نے بہت سے علمی کارنامے سرانجام دیئے۔ فراغت کے بعد دارالعلوم سے وابستہ ہوگئے اور ناظمِ برقیات کے طور پر بیش بہا خدمات انجام دیں۔ قضیۂ دارالعلوم کے بعد جب حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم وقف کا آغاز فرمایا تو مولانا اسلم صاحبؒ بھی اس سے وابستہ ہوگئے اور بطور مدرس پہلی بار تقرری عمل میں آئی۔ مولانا نے اس میدان میں آتے ہی اپنی نئی پہچان بنالی۔ تدریس میں مہارت کے ساتھ وعظ وارشاد میں بھی اپنی مہارت اور صلاحیت کا بھرپور ثبوت دیا۔ ملک وبیرونِ ملک میں بارہا اسفار ہوئے۔ دارالعلوم وقف میں تدریس کے بعد شیخ الحدیث، ناظمِ تعلیمات اور صدرالمدرسین کے مناصب کو بھی رونق بخشی۔ مرحوم کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں ''سیرتِ پاک'' زیادہ مشہور ہے۔ عربی زبان میں سیرت کی ممتاز کتاب کا ''سیرتِ حلبیہ'' کے نام سے شان دار ترجمہ کیا، جسے علمی دنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہیں شعر وادب سے بڑی گہری دل چسپی تھی۔ بانی جامعہ حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بڑی محبت فرماتے تھے اسی محبت وتعلق کی بنیاد پر جامعہ میں گاہے بگاہے تشریف لاکر اس کی ترقی کے لیے دعا فرماتے تھے۔

❀❀❀ فرحمه الله رحمةً واسعةً ❀❀❀

نقد ونظر

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث و نائب ناظم تعلیمات جامعہ ہذا

نام کتاب: دورِ حاضر کے جدید مسائل
مصنف: مولانا مفتی باقر ارشد صاحب
صفحات: 568۔ قیمت: 495
ناشر: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز دہلی

اسلام ایک مستقل ضابطۂ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ دنیا میں یہی ایک مذہب ہے جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر محاذ پر واضح ہدایات رکھتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قرآن کا نزول خاص اسی لیے ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیات اسی مہم میں گزری۔ آپ کی ساری عمر قرآن کی تشریح میں بسر ہوئی۔ قرآن اسلام کی آئینی کتاب ہے۔ اس میں حیاتِ آدمی کے لیے ساری دفعات بیان کر دی گئی ہیں۔ جس طرح عدالت کو آئین وضع کرنے کا حق تو نہیں ہوتا، مگر تشریح کا حق اس کے پاس ہے، اسی طرح آئینِ زندگی قرآن کی شکل میں فاطرِ ہستی نے مرتب فرمایا، مگر تشریح کا سارا حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا، چناں چہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر خالقِ کائنات نے کہا ہے: هو الذی انزل علیك الكتاب لتبین للناس ما نزل الیهم ولعلهم یتفكرون۔ اسی لیے علمائے امت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور معمولات کو تشریحات القرآن سے تعبیر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وعمل اور طریقِ حیات سے اسلامی اصول و آداب اور ضابطہ حیات کو مشرح فرما دیا۔ یہ دین چوں کہ قیامت تک کے لیے آیا ہے، اس لیے آپ نے صحابہ کرام کی شکل میں رجالِ کار تیار فرما دیے، جنہوں نے اپنی پوری دیانت اور تن دہی سے اپنے عصر کے انسانوں تک پہنچایا، اس طرح شدہ شدہ یہ دین ہم تک پہنچا۔ اس طرح مختلف میدانوں کی شخصیات سامنے آئیں اور اسلام خوش خرامی کے ساتھ پیہم آگے بڑھتا رہا۔ تا بہ روزِ حشر اسی طرح بڑھے گا۔

ان شخصیات میں کچھ وہ بھی ہیں، جنہوں نے قرآن وحدیث میں غواصی کر کے انسانی حیات کے تمام گوشوں کو مرتب و مدون کر دیا۔ یہ رجالِ کار فقہا کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا، بلکہ

قرآن وحدیث ہی میں ظاہر و مخفی مسائل کو ترتیب وار بیان کردیا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فقہ قرآن وحدیث کا معاند نہیں، بلکہ قرآن وحدیث کا عطر اوران کی مرتب تشریح ہے۔ قرآن وحدیث پر مکمل دستگاہ کے بغیر کوئی فقیہ نہیں ہوسکتا۔ فقیہ کی نظر بڑی عقابی اوراس کی فراست سب میں ممتاز ہوتی ہے۔

جب سے فقہ مرتب ہوا، اس وقت سے آج تک عہد بہ عہد اس کی خدمت ہوتی آئی ہے۔ فقہا نے ہر زمانے کے حساب سے مسائل کا استنباط واستخراج کیا ہے اور امت کی دینی رہ نمائی کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔

وقت جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے، مسائل میں دن بہ دن تنوع پیدا ہوتا جارہا ہے۔ عجیب عجیب صورتِ حال پیش آتی جارہی ہیں۔ لیکن اسلام ان تمام پریشانیوں کا حل لے کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ سارے حل کتابی صورت میں محفوظ ہوچکے ہیں۔ انہیں میں سے ایک کتاب زیرِ تبصرہ تصنیف بھی ہے۔ کتاب اپنے ظاہر اور باطن کے اعتبار سے بصیرت وبصارت افزا ہے اور نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

چودہ موضوعات پر مشتمل یہ تصنیف لطیف واضح اور مدلل روشنی ڈالتی ہے، ان میں قرآنِ کریم کے متن وترجمہ اور بریل کوڈ سے متعلق بعض مسائل، دورِ جدید میں عقدِ استصناع کے بعض مسائل، آبی وسائل اور ان سے متعلق شرعی احکام جیسے جدید موضوعات پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور امت کی مشکلات کو بڑے سلیقے سے دور کیا گیا ہے۔ کتاب علمی اور افہام وتفہیم سے بھرپور ہے۔ مصنف نے اپنی ذہنی بیداری اور فنی چابک دستی کا شاندار نمونہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے مصنف مولانا باقر ارشد صاحب ہیں۔ کرناٹک سے تعلق رکھتے ہیں۔ علمی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ کئی کتابیں ان کے قلم سے آچکیں۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے فاضل اور فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ صاحب کے باختصاص شاگرد ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے اس جلیل استاذ کا کم وبیش ڈیڑھ صفحے میں ذکرِ جمیل کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ ان پر بڑے کرم فرما رہے۔ مصنف نے اپنی اس اہم ترین کاوش کو اپنی مادرِ علمی سے منسوب کیا ہے۔

کتاب گراں قدر اور علمی ہے۔ اہلِ علم اور طلبہ کے لیے خصوصی تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ طلبہ کو جدید مسائل سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔ عام باذوق قارئین بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے۔

کتاب مواد سے بھرپور اور معیاری ہے، طباعت بھی اعلیٰ معیار پر رکھی گئی ہے۔ تحریر روشن، کاغذ دبیز اور جلد دیدہ زیب ہے۔

Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband

Register from Registrar of Newspapers for India U.P. URD.2000/R.N.10663

Contact: (Off) 01336-220471, Mob. +91 8006075484

Email: ahmadanzarshah@gmail.com

Printed & Published by Syed Ahmad Khizar Shah,
Mohtamim of behalf of JIMAS, Behind Eidgah, DBD
and Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers, Deoband

مسجد انور شاہ کا دیدہ زیب نظارہ

انور ہال

مسجد انور شاہ کے برآمدے کا منظر

دار الحدیث (انور ہال) سے باب معظم شاہ تک نوتعمیر شدہ سڑک

دفتر تعلیمات و دفتر اہتمام کا برآمدہ

دار الاقامہ کا اندرونی منظر

کتب خانہ

جامعہ کا مطبخ

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah

A/c No. 520101265117956

Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786